صفحات ۸۰ ... قیمت تحریر نہیں، پتے۔ (۱) سنٹرل جمعیۃ تبلیغ الاسلام ۹۶/۲۲ ناظر باغ کانپور، (۲) فریدی بلڈنگ، سنبھلی گیٹ، مراد آباد،

یہ سکھوں کے مشہور مذہبی رہنما گورو نانک جی کے حالات و تعلیمات کا مختصر خاکہ ہے، پہلے ان کی تعلیم و تربیت سیر و سیاحت اور ان پر مسلمان صوفیوں کے اثرات وغیرہ کا ذکر ہے۔ اور آخر میں ان کی ہدایات و تعلیمات نام (حقوق اللہ) دان (حقوق العباد) اسنان (جان و تن کے حقوق) اور دوسرے خیالات کی تشریح و وضاحت کی گئی ہے۔ مصنف نے دکھایا ہے کہ گورو جی ہندوستان کے تمام فرقوں میں اتحاد و یکجہتی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اور ان کی تعلیمات اسلامی رنگ میں رنگی ہوئی تھیں، اور گورو گرنتھ صاحب کے شلوکوں (شعروں) میں توحید و رسالت اور آخرت پر ایمان لانے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس کتاب میں گورو جی مہاراج کی اصل تعلیمات پیش کر کے ان کے پیرووں اور سکھ حضرات کو ان پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

شاعروں کی صلیب مرتبہ جناب کرامت علی کرامت صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۸۴ مجلد قیمت ے/ پتہ شاخسار پبلیشر بخشی بازار، کٹک ۱

جناب کرامت علی کرامت کا وطن اڑیسہ ہے وہ وہاں کے ایک کالج میں ریاضی کے استاد ہیں لیکن اسکے باوجود انکو اردو شعر و ادب کا اچھا ذوق ہے، اڑیسہ سے شائع ہونے والا دو ماہی شاخسار ان ہی کی ادارت میں چھپتا ہے، اسمیں اور دوسرے ادبی رسائل میں انکا کلام اور ادبی و تنقیدی مضامین چھپتے رہتے ہیں "شاعروں کی صلیب" انکا پہلا مجموعہ کلام ہے اور نظموں و غزلوں پر مشتمل ہے کرامت صاحب کا کلام غور و تامل کا نتیجہ اور سطحیت و رکاکت سے خالی ہے امید ہے کہ جدید شاعری کے قدر دانوں میں یہ مجموعہ کلام مقبول ہوگا شروع میں انھوں نے اپنے حالات اور شاعری کے متعلق معلومات بھی تحریر کئے ہیں۔

"ض"

سنہ ۱۳۹۴ھ — سنہ ۱۹۷۴ء
جلد ۱۱۳ ماہ ربیع الثانی مطابق ماہ مئی، نمبر ۵

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۳۲۲-۳۲۴
مقالات		
سفر حج کی مختصر روداد	شاہ معین الدین احمد ندوی	۳۲۵-۳۳۵
حدیث کا درایتی معیار	جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۳۳۶-۳۵۶
انشورنس (اسلامی نقطۂ نظر سے)	ڈاکٹر عبید الرحمن تاج مترجمہ مولوی محمد ایوب صاحب اصلاحی استاد مدرسۃ الاصلاح سرائے میر	۳۵۷-۳۶۵
خواجہ عزیز الدین عزیز کی شاعری	جناب سید ضیاء الحسن صاحب لکچرر اردو و فارسی مجیدیہ کالج، الہ آباد	۳۶۶-۳۸۷
مکتوب سری لنکا	جناب پروفیسر ڈاکٹر اختر امام صدر شعبہ اسلامیات و عربی سری لنکا یونیورسٹی	۳۸۸-۳۹۷
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۳۹۸-۴۰۰

شذرات

ہندوستان و پاکستان کے درمیان تجارت کی بندش سے یوں ہی دارالمصنفین کئی سال سے سخت مالی مشکلات میں مبتلا تھا، اب سامان طباعت خصوصاً کاغذ کے قحط اور ہوش ربا گرانی نے مشکلات میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے، اور معارف پریس کو قائم رکھنے کی کوئی شکل نظر نہیں آرہی ہے، اگر بند کر دیا جائے تو پریس کا پورا عملہ بیکار ہو جائے گا، اور دارالمصنفین کا ایک اہم شعبہ جس سے بڑی سہولت حاصل تھی ختم ہو جائے گا، اور اگر قائم رکھا جاتا ہے تو مفت تنخواہوں کا بار اٹھانا پڑے گا، اس وقت متعدد اہم اور چالو کتابیں ختم ہو گئی ہیں کئی نئی کتابیں تیار ہیں، مگر ان کے چھاپنے کا سامان نہیں، اولاً کاغذ بڑی مشکل سے ملتا ہے، اور اگر مل بھی جاتا ہے تو اتنا گراں کہ خریدنے کی ہمت نہیں پڑتی، دارالمصنفین کی کتابوں کے خریداروں کا حلقہ یوں بھی محدود تھا۔ ملک کے اقتصادی حالات نے اور بھی محدود کر دیا ہے، اب اگر سامان طباعت کی گرانی کے تناسب سے ان کی قیمتوں میں اضافہ کیا جاتا ہے تو ان کے خریدار اور بھی کم ہو جائیں گے، فی الحال ان مشکلات کے حل کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آرہی ہے، لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا

آزادی سے پہلے یہ خیال عام تھا کہ ہندوستان کی ساری مصیبت انگریزوں کی لائی ہوئی ہے، ان کے جاتے ہی ہندوستان جنت نشان بن جائے گا، یہاں شہد اور دودھ کی گنگا جمنا بہیں گی، ہر شخص آسودہ حال ہو گا، لیکن آزادی کے بعد اس خواب کی تعبیر الٹی نکلی اور ملک اتنے گوناگوں مصائب میں گھر گیا ہے، کہ لوگ بے اختیار انگریزی عہد کی آسائشوں کو یاد کرنے لگے ہیں، یہ صحیح ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان نے تعمیری اور صنعتی حیثیت سے بڑی ترقی کی ہے، بڑے بڑے منصوبے چل رہے ہیں، عظیم الشان کارخانے قائم ہو گئے ہیں، جہاں سوئی نہیں بنتی تھی وہاں ٹینک اور ہوائی جہاز بننے لگے ہیں بہت سے جھونپڑیوں کے رہنے والے بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہنے لگے ہیں، پیدل چلنے والے ہوائی جہاز پر اڑے پھرتے ہیں، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ ان ترقیوں کے باوجود زندگی کا امن و سکون ختم ہو گیا ہے ملک میں بدامنی عام ہے، ضروریات زندگی کی ہوش ربا گرانی نے ایک بڑے طبقہ کی زندگی وبال کر دی ہے، کوئی شخص بھی جائز آمدنی سے ضروریات زندگی پوری نہیں کر سکتا، صرف رشوت خوروں اور چور بازاری کرنے والوں کا معیار زندگی اونچا ہوا ہے، جو لوگ اس سے محروم ہیں، ان کے لئے زندگی بسر کرنا مشکل ہو رہا ہے، ایسی ترقی کس کام کی کہ ملک کے ایک طبقہ کا گھر دولت سے بھر جائے اور ایک طبقہ کو پیٹ بھر کھانا اور ستر پوشی کے لیے کپڑا بھی میسر نہ ہو، اخلاقی معیار اتنا گر گیا ہے کہ کسی کو بھی ملک کے مفاد کی فکر نہیں ہر شخص دولت سمیٹنے کی دھن میں مبتلا ہے، اسی لئے اگر حکومت حالات کی اصلاح بھی کرنا چاہتی ہے تو کامیاب نہیں ہو پاتی اور عوام کی اس بے اطمینانی سے حکومت کے مخالفین فائدہ اٹھاتے ہیں ایک عام آدمی کو سوشلزم کا فلسفہ سمجھانے سے تسکین نہیں ہوتی وہ تو اسکے نتائج دیکھنا چاہتا ہے، اسکی نگاہ میں ترقی کا معیار بڑے بڑے کارخانے نہیں بلکہ ضروریات زندگی کا حصول ہے، اگر ستائیس سال کی طویل مدت میں سوشلزم کے کچھ بھی نتائج نکلتے تو حسن ظن سے کام لیا جا سکتا تھا، لیکن جس قدر سوشلزم کا شور بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر ضروریات زندگی گراں اور عنقا ہوتی جاتی ہیں ہر چیز کی قیمت آسمان تک پہنچ گئی ہے، اسی قسم کے حالات انقلاب کو دعوت دیتے ہیں جس کے آثار شروع ہو گئے ہیں، ان کو سختی یا طفل تسلی سے نہیں دبایا جا سکتا اسکا علاج صرف یہ ہے کہ عوام کو مطمئن کیا جائے،

اس سلسلہ میں ایک تقریب سے سوشلزم کے برادر اکبر کمیونزم کی یاد آگئی، ابھی حال میں روسی سفارت خانے سے عربی میں ایک بڑی دیدہ زیب کتاب "المسلمون فی الاتحاد السوفیتی" ہمارے پاس آئی ہے جس میں تصویروں کی زبان سے سوویت یونین کی مسلمان ریاستوں کی مذہبی آزادی اور مادی ترقی دکھائی گئی ہے،

اور اس سے متعلق مضامین اور مختلف اسلامی ملکوں کے ان سربرآوردہ مسلمانوں کے بیانات بھی نقل کئے گئے ہیں، جنھوں نے انکا مشاہدہ کیا ہے، تصویروں میں مساجد، نماز، مدارس اور دوسرے اسلامی آثار اور صنعتی ترقی کی تصویریں ہیں، مگر اب اس قسم کے تماشے اتنے ہوتے رہتے ہیں کہ انکا کوئی اثر باقی نہیں رہ گیا ہے، یہ کوئی نہیں کہتا کہ روس میں مذہبی شعائر ادا کرنے کی اجازت نہیں ہے، گو ایک زمانہ میں یہ بھی جرم تھا مگر اب پالیسی بدل گئی ہے، مسلمان اپنے مذہبی شعائر ادا کر سکتے ہیں، بعض مسجدوں میں جمعہ اور عیدین کی نمازیں بھی ہوتی ہیں جن میں کچھ پرانی نسل کے بوڑھے اور روس میں مقیم اسلامی ملکوں کے مسلمان شریک ہوتے ہیں، بہت سے اسلامی آثار بھی محفوظ ہیں اور مسلمان ریاستوں نے مادی حیثیت سے ترقی بھی کی ہے، بلکہ اس سال روس میں امام بخاری کا یادگاری جشن بھی منایا جا رہا ہے، لیکن ان میں سے ایک چیز بھی مذہبی آزادی کا ثبوت نہیں ہے، دیکھنا یہ ہے کہ سویٹ یونین سے پہلے یہاں کے مسلمانوں کی مذہبی حالت کیا تھی اور اب کیا ہے، اگر چند مسجدیں آباد ہیں تو ہزاروں ویران ہیں، اگر چند جدید علوم کی یونیورسٹیاں قائم ہو گئی ہیں تو سیکڑوں دینی مدارس ختم کر دئے گئے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ اس زمانہ میں کسی قوم و ملت کے مذہب اور کلچر کو زور و قوت سے مٹانا آسان نہیں ہے، اس لیے اب جبر کی پالیسی بدل گئی ہے اور تعلیم و تربیت اور الحاد و بے دینی کی ترویج و اشاعت کا ایسا نظام قائم کیا گیا ہے کہ نئی نسل مذہب پر قائم ہی نہیں رہ سکتی اور کمیونزم کے رنگ میں رنگ جاتی ہے، جو ملک بھی کسی قوم و ملت کے کلچر کو بدلنا چاہتے ہیں وہ اسی قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں، چنانچہ روس کے مسلمانوں کی نئی نسل مذہب سے بالکل بیگانہ ہو چکی ہے، کچھ مستثنیٰ مثالیں بھی نکل آئیں، درحقیقت کمیونزم کی بنیاد ہی الحاد و دہریت پر قائم ہے، اور اس پر آج بھی مذہبی اثرات کو مٹانے کے لیے، روس کے ممتاز کمیونسٹوں کے بیانات شاہد ہیں، اگر کسی قوم و ملت کے مذہب اور کلچر کو مٹا کر اس کو مادی ترقی کے بام عروج پر بھی پہنچا دیا جائے تو یہ ترقی نہیں، بلکہ نسل کشی ہوئی، صحیح ترقی اور آزادی کا تصور یہ ہے کہ ہر ملت اور ہر فرقہ کو اس کی مذہبی و تہذیبی خصوصیات کے ساتھ ترقی کا موقع دیا جائے۔

مقالات

سفرِ حج کی مختصر روداد

از شاہ معین الدین احمد ندوی

(۲)

حج کے انتظامات اور اس کی آسانیاں

جو لوگ حج کے سفر میں تن آسانی اور راحت ڈھونڈتے ہیں یا جو ترقی یافتہ ملکوں کے انتظامات سے حج کے انتظامات کا موازنہ کرتے ہیں انکی نظر اس کی خامیوں اور حج کی مشقتوں پر پڑتی ہے، وہ یہ نہیں دیکھتے کہ سعودی حکومت سے پہلے حج میں کتنی مشکلات تھیں اور اب کتنی آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں اور جو خامیاں باقی ہیں وہ بھی حکومت کی توجہ سے رفتہ رفتہ دور ہوتی جاتی ہیں،

جو لوگ حج کو عبادت سمجھتے ہیں ان کو راحت ہی راحت معلوم ہوتی ہے، تکلیفوں اور مشکلات کی طرف ان کی نظر ہی نہیں جاتی، حج ایک عاشقانہ عبادت ہے، اس کے سارے مناسک عاشقانہ ہیں جن میں تکلیف اور مشقت اٹھانا ضروری ہے ؎

ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں
اس کے بغیر اس کی تکمیل نہیں ہوتی

نازپروردہ تنعم نبرد راہ بدوست
عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد

اس پہلو سے قطع نظر خالص مادی حیثیت سے پہلے کے مقابلہ میں اب اتنی سہولتیں اور آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں کہ حج نہیں رہ گیا ہے بلکہ تفریحی سفر بن گیا ہے۔

پہلے سرزمین حجاز پر قدم رکھتے ہی ہر قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا، جدہ میں جدید طرز کی کوئی بندرگاہ نہ تھی، جہاز ساحل سے کئی میل دور سمندر ہی میں کھڑے ہوتے تھے، اور مسافر اور اُن کا سامان کشتیوں کے ذریعہ آتا تھا جس سے ان کو بڑی زحمت اٹھانا پڑتی تھی کبھی کبھی سامان کشتیوں پر اتارنے میں سمندر میں گر پڑتا تھا، اب جدید طرز کی بڑی وسیع بندرگاہ بن گئی ہے جس میں بیک وقت کئی بڑے بڑے جہاز ٹھہر سکتے ہیں، اور حجاج براہِ راست بندرگاہ پر اترتے ہیں، پہلے جدہ میں حکومت کی طرف سے حاجیوں کے قیام کا کوئی انتظام نہ تھا، معلم جہاں چاہتے تھے ٹھہراتے تھے، جس سے حاجیوں کو بڑی زحمت ہوتی تھی، اب حکومت نے مدینۃ الحجاج کے نام سے کئی منزل کی ایک وسیع عمارت بنوا دی ہے جس میں کئی ہزار حاجی بیک وقت ٹھہر سکتے ہیں، اس میں قیام کی ہر طرح کی سہولتیں ہیں، پہلے سڑکیں، بسیں اور کاریں نہ تھیں، اونٹوں سے سفر کرنا پڑتا تھا، جدہ سے مکہ معظمہ کل چالیس بیتالیس میل ہے، یہ مسافت اونٹوں کے ذریعہ کم سے کم دو دن میں طے ہوتی تھی، اور مکہ سے مدینہ کے سفر میں دس بارہ دن لگتے تھے، اب پورے حجاز میں اعلیٰ درجہ کی ڈامر کی سڑکیں بن گئی ہیں، صبا رفتار موٹریں ہیں جن کے ذریعہ دنوں اور ہفتوں کی مسافت چند گھنٹوں میں طے ہو جاتی ہے۔

پہلے بدوؤں سے حاجیوں کی جان و مال محفوظ نہ تھا، قافلوں کی حفاظت کا بڑا انتظام کرنا پڑتا تھا، اس کے باوجود کبھی کبھی قافلے لٹ جاتے تھے، اور ان کی جانیں ضائع ہو جاتی تھیں، اب اس قدر امن و امان ہے کہ کوئی شخص کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا، اگر کسی کا سامان گم ہو جائے تو کوئی شخص اس کو نہیں اٹھا سکتا، پولیس خود سرکاری مال خانے میں لیجا کر جمع

کرتی ہے، اور وہ تلاش کے بعد مالک کو ملجاتا ہے،

پانی اس قدر کمیاب تھا کہ سونے کے بھاؤ بکتا تھا، منیٰ اور عرفات میں لوگ ایک ایک گلاس پانی کے لیے ترستے تھے۔ اب ہر جگہ نل لگے ہیں جتنا چاہے پانی صرف کیجئے، منیٰ، عرفات اور مزدلفہ تک میں پانی کی افراط ہے، آئس کریم اور ٹھنڈے مشروبات کی بکثرت دوکانیں ہیں، برف کے ڈھیر لگے رہتے ہیں خوب سیر ہو کر پیجئے،

پہلے منیٰ عرفات اور مزدلفہ کے راستے اس قدر تنگ تھے کہ راستہ چلنا دشوار ہوتا تھا اب ان تمام مقامات میں کئی کئی کشادہ ڈامر کی سڑکیں بن گئی ہیں، پیدل چلنے والوں کے لئے علیحدہ سڑک ہے جس سے آمد و رفت میں بڑی سہولت پیدا ہو گئی ہے، لیکن پندرہ سولہ لاکھ انسانوں کے ہجوم کے نقل و حرکت میں کچھ نہ کچھ دشواری تو ضرور ہوگی یہی وضع ہو کہ ہجوم کسی ایک جگہ نہیں رہتا بلکہ چار پانچ دن تک محدود وقت میں کئی مقامات پر منتقل ہوتا رہتا ہے اتنے بڑے مجمع کو چند گھنٹوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا بہت دشوار ہے، یہ حکومت کا حسن انتظام ہے کہ یہ کام آسانی سے انجام پا جاتا ہے، اس کے لیے حکومت بڑے وسیع انتظامات کرتی ہے خود شاہ فیصل، شاہی خاندان کے ارکان اور حکومت کے وزراء و عمال منیٰ اور عرفات میں موجود رہتے ہیں جس سے پورا انتظامی عملہ مستعد اور چوکنا رہتا ہے،

اس سال ٹرافک کو کنٹرول کرنے کے لئے سات ہزار پولیس کے سپاہی مقرر تھے حجاج کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لئے دو لاکھ بسیں اور کاریں تھیں، ہر پچاس ساٹھ قدم پر پولیس کے سپاہی متعین تھے، اور خاص بات یہ تھی کہ وہ حجاج پر کسی قسم کی سختی نہیں کرتے تھے، بلکہ بڑی نرمی اور سہولت کے ساتھ مجمع اور سواریوں کو کنٹرول کرتے تھے، اگر ہندوستان کے بڑے میلوں سے ان کا موازنہ کیا جائے تو زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے، اور یہ فضا میں

کئی کئی ہیلی کوپٹر جن کا رابطہ پولیس اسٹیشن سے قائم رہتا تھا مجمع کو دیکھتے رہتے تھے، جہان کوئی دشواری نظر آتی فوراً پولیس اسٹیشن کو خبر دیتے، ایک ایک دو دو فرلانگ کے فاصلہ پر کرین نصب تھے کہ اگر کوئی بس یا کار خراب ہو جائے اور مجمع کی کثرت کی وجہ سے اسکو بچا نہ جاسکے تو کرین کے ذریعہ اسکو اٹھا لیا جائے اور اس کی جگہ دوسری بس یا کار رکھ دیجائے، اتفاقی حوادث کے لیے ہر آدھے گھنٹے کے بعد ایک ایمبولنس کار گذرتی تھی جس میں فرسٹ ایڈ کا پورا سامان رہتا تھا، اس کے ہارن کی خاص قسم کی آواز تھی جس سے پتہ چل جاتا تھا کہ ایمبولنس کار ہے، رات کو اس میں سرخ رنگ کی تیز روشنی ہوتی تھی،

اتنا وسیع طبی انتظام بڑے بڑے ملکون مین بھی مشکل سے ہوگا جتنا حجاج کے لیے ہوتا ہے، مکہ اور مدینہ مین حکومت کے متعدد بڑے اسپتال ہیں، پھر ہر اسلامی ملک اپنا مستقل اسپتال بھیجتا ہے جس میں علاج کا مکمل سامان موجود ہوتا ہے، ہندوستان کا اسپتال بھی ہوتا ہے، اس سال اس میں آٹھ دس ڈاکٹر تھے، اس سے اسلامی ملکون کے اسپتالون کا قیاس کیا جاسکتا ہے، پھر ان کی ڈسپنسریاں حاجیون کے ساتھ منیٰ و عرفات میں منتقل ہوتی رہتی ہیں،

حکومت کی جانب سے حجاج کی راحت رسانی کے لیے بڑے سخت احکام ہیں، یہ اور بات ہے کہ ہر حاجی ان سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔

بعض اصلاح طلب امور | اس حسن انتظام کے باوجود اب بھی بعض چیزین اصلاح طلب اور حکومت کی توجہ کی محتاج ہیں، ان میں سب بڑا مسئلہ مکہ معظمہ میں مکانوں کا ہے، ضرورت کے لحاظ سے مکان بہت کم ہیں، اس لئے حج کے زمانہ میں انکا کرایہ ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ جاتا ہے، ایک معمولی کمرہ جس میں مشکل سے تین چار آدمیون کے رہنے کی گنجائش ہوتی ہے، ہزار بارہ سو ریال سے کم میں نہیں ملتا، اور مکانوں کی قلت اور کرایہ کی گرانی کی وجہ سے

ایک ہی کمرہ میں سات آٹھ ادمی رہنے پر مجبور ہوتے ہیں، یہ بھی واضح رہے کہ مسلمان حکومتین بھی زرِ تبادلہ بچانے کے لیے اپنے یہاں کے حاجیوں کو محدود رقم دیتی ہیں جو اس گرانی کے زمانہ میں کھانے پینے وغیرہ کے ضروری مصارف کے لیے بھی مشکل کافی ہوتی ہے، اس میں اتنے گران کرایہ کی گنجائش مطلقاً نہیں ہوتی، جس سے اکثر حجاج کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور وہ قرض لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس کا ملنا مکہ میں آسان نہیں ہے، اس مشکل کو دور کرنے کی شکل یہ ہے کہ حکومت جدہ کے مدینۃ الحجاج کی طرح مکہ معظمہ میں بھی عمارتین بنوا دے اور حاجیوں سے اس کا مناسب کرایہ لے لیا کرے، اس سے کچھ دنوں میں اس کے مصارف بھی وصول ہو جائیں گے اور حاجیوں کو بھی سہولت ہوگی، حکومت کے پاس روپیہ کی کمی نہیں، وہ اس کام کو آسانی سے انجام دے سکتی ہے، جب تک یہ انتظام نہیں ہوتا حکومت کو خود مکانوں کا کرایہ مقرر کرنا چاہیئے، مکانات کے مالک تو ان حاجیوں کو لوٹتے ہیں۔

اگرچہ حکومت کی طرف سے حفظانِ صحت کا انتظام ہے، جراثیم کش دوائیں چھڑکی جاتی ہیں، سڑکین صاف رہتی ہیں مگر گلیان گندی رہتی ہیں، اس لئے صفائی میں مزید اہتمام کی ضرورت ہے، خصوصاً منیٰ میں جہان حاجیون کو خیموں میں کئی دن ٹھہرنا پڑتا ہے، اس کی ذمہ داری حکومت سے زیادہ ان حاجیون پر ہے جو صفائی کا خیال نہیں رکھتے اور خیموں کے سامنے کوڑے کرکٹ اور گندگی کا ڈھیر لگا رہتا ہے۔

منیٰ اور عرفات میں تو وسیع اور کشادہ سڑکوں کی وجہ سے آمد و رفت میں بڑی سہولت ہوگئی ہے لیکن رمی جمار کے میدان اور مذبح میں توسیع کی ضرورت ہے۔ مجھے تو مذبح جانے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن سنا ہے کہ وہاں جانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، جانوروں کی لاشوں اور ان کی آلائش کو روندتے ہوئے جانا پڑتا ہے، کوئی شخص اسکی

غلاظت سے بچکر نہیں آسکتا۔ ذبح کرنے والے اس بے احتیاطی سے چھری چلاتے ہیں کہ اگر آنے جانے والے خود احتیاط نہ کریں تو ان کے ذبح ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے اسلئے مذبح کو وسیع، پختہ اور جانوروں کے ذبح کرنے کا مرتب نظام قائم کرنے کی ضرورت ہے، پولیس کی نگرانی سے بھی کچھ سہولت ہو سکتی ہے، معلوم ہوا ہے کہ مذبح کی ترمیم کیلئے حکومت نے کئی کرور کی رقم منظور کی ہے، خدا کرے جلد یہ منصوبہ پورا ہو جائے،

اس سے بھی بڑا مسئلہ رمی جمار کا ہے، اگرچہ پہلے کے مقابلہ میں اس کا میدان وسیع ہو گیا ہے، لیکن حاجیوں کی کثرت کے مقابلہ میں اب بھی تنگ ہے، اس سلسلہ میں ایک فقہی مسئلہ پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے، پہلے دن کی رمی جس کا وقت صبح سے دوپہر تک نسبتہً آسان ہے، لیکن ۱۱-۱۲ کی تینوں جمروں کی رمی جس کا وقت زوال کے بعد سے غروب آفتاب تک ہے بہت دشوار ہے، اتنے وقت میں ۱۵، ۱۶ لاکھ آدمی رمی نہیں کر سکتے خصوصاً مسنون آداب کے ساتھ تو ناممکن ہے، ۱۱ اور ۱۲ کی رمی میں آدمیوں کا اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ جمرہ تک کمزور آدمیوں کا پہنچنا بہت دشوار ہوتا ہے، اگر اس ہجوم میں کوئی شخص گر پڑے تو پھر اٹھنا بہت دشوار ہے ایسی حالت میں مسنون طریقہ سے رمی کا کیا امکان ہے، اس کی پابندی میں اس مرتبہ مولانا ابوالحسن علی کی جان جاتے جاتے بچی، اسی لئے اس مشکل کا حل نکالنے کی ضرورت ہے۔

کبھی کبھی اس قسم کی دشواری طواف میں بھی مقام ابراہیم کی سمت پیش آتی ہے اس میں حاجیوں کی ناواقفیت اور ان کی بدنظمی کو زیادہ دخل ہے، یہ دشواری طواف کے بعد کی نفلین مقام ابراہیم کے پاس مطاف کے اندر پڑھنے سے پیش آتی ہے، اگر مطاف کے باہر نفلین پڑھی جائیں تو جگہ کی اتنی تنگی نہ ہو، مقام ابراہیم کے پاس

نفلین پڑھنا مسنون ہے لیکن مطاف کے اندر ضروری نہیں ہے، اگر جگہ تنگ ہو تو پورے حرم میں کسی جگہ بھی پڑھی جا سکتی ہیں، مطاف کے اندر پڑھنے سے صرف طواف کرنے والوں کو دشواری نہیں ہوتی، بلکہ پڑھنے والوں کی کثرت کی وجہ سے نماز کے ارکان بھی صحیح طریقہ سے ادا نہیں کئے جا سکتے،

اس سلسلہ میں دوسرا مسئلہ عورتوں کے طواف کا ہے، عورت اور مرد ساتھ ساتھ طواف کرتے ہیں، اس لئے اس ہجوم میں عورتوں اور مردوں کے اختلاط سے احتیاط نہیں ہو سکتی، خود عورتیں پلی پڑتی ہیں خصوصاً مصر و افریقہ کی عورتیں تو اتنی مردانہ ہیں کہ مردوں کو دھکے دیکر ہٹا دیتی ہیں، اسی قسم کا ہجوم مسجد نبویؐ خصوصاً مواجہہ شریف میں بھی ہوتا ہے، مسجد نبویؐ میں اگرچہ عورتوں کے لئے ایک جگہ مخصوص ہے، اسکے باوجود بعض عورتیں مردوں کی صف میں گھس آتی ہیں، ایک دن ایک عورت کو جو مردوں کی صف میں گھسنا چاہتی تھی، مسجد نبویؐ کے ایک خادم (اغوات) نے ہٹانا چاہا تو اس نے اس زور سے خادم کو دھکا دیا کہ اس کا عمامہ گر گیا، اور بڑی مشکل سے اس عورت کو ہٹایا جا سکا، اگرچہ ان چیزوں کی اصلاح مشکل ہے لیکن کسی نہ کسی حد تک تو ہو سکتی ہے۔

ملک فیصل بڑے مدبر، بیدار مغز اور زمانہ کے حالات سے باخبر حکمران ہیں، بین الاقوامی سیاست پر بھی ان کی پوری نظر ہے، انھوں نے یورپ اور امریکہ کا سفر کر کے ان کی ترقیوں کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے، اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے بغیر آج کی دنیا میں کوئی ملک زندہ نہیں رہ سکتا، وہ اگرچہ بادشاہ ہیں، لیکن ان کا مزاج جمہوری ہے، اور وہ ملک کی دولت اس کی فلاح اور تعمیر و ترقی پر صرف کرتے ہیں، چنانچہ

اس وقت سعودی عرب میں بہت سے ایسے منصوبے چل رہے ہیں جو ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے ضروری ہیں اور آیندہ اس کا نہایت وسیع پروگرام ہے، راقم کو ان کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن سعودی حکومت نے اس پر جو کتابیں شائع کی ہیں، ان کے مطالعہ اور ان کی تصویریں دیکھنے کا موقع ملا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سعودی حکومت تعمیر و ترقی کی ہر راہ میں گامزن ہے، اسکا ایک مظہر عمارتیں ہیں جن کو ہر شخص ہر جگہ دیکھ سکتا ہے، مکہ مدینہ، جدہ اور طائف وغیرہ میں معلوم ہوتا ہے کہ نئے نئے ڈیزائن کی عمارتیں سبزہ کی طرح زمین سے اُگ رہی ہیں، جدہ تو یورپ کا ماڈرن شہر معلوم ہوتا ہے، سنا ہے کہ ریاض اس سے کہیں آگے ہے۔

یورپ کی صنعتی تہذیب ترقی کا ایسا معیار اور قوموں کی موت و حیات کا ایسا مدار بن گئی ہے کہ کوئی قوم بھی اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، اور ہر قوم اپنی بقا کے لیے اس کے اختیار کرنے پر مجبور ہے اور وہ ہوا کی طرح ساری دنیا میں سرایت کر گئی ہے، اس سے انکار نہیں کہ انسانیت کو اس سے بڑے مادی فوائد پہنچے لیکن اسکی سب سے بڑی خرابی جس نے اس کی ساری خوبیوں پر پانی پھیر دیا ہے اسکا مادی تصور حیات اور اس کے نتائج ہیں، اور یہ دونوں ایسے لازم و ملزوم ہیں کہ ایک کو اختیار کرنے کے بعد دوسرے سے بچنا بہت مشکل ہے، یہ تہذیب مادی ترقیوں اور انسانی آسائشوں کے باوجود اپنے ساتھ ناخدا شناسی اور الحاد و دہریت بھی لاتی ہے۔

جو انسانیت کے لیے پیام ہلاکت ہے، مذہبی نقطۂ نظر سے قطع نظر خالص دنیاوی حیثیت سے بھی اس کے بہت بُرے نتائج نکلتے ہیں، اخلاق و روحانیت کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی، اخلاقی حدین ٹوٹنے کے بعد پھر انسانی آزادی کی کوئی حد باقی نہیں رہتی اور

وہ ہر پہلو سے حیوانیت بن جاتی ہے، جس پر دنیا خصوصاً یورپ کے حالات شاہد ہیں اسلئے مشرقی قوموں خصوصاً مسلمانوں کے لئے یہ بڑا مسئلہ ہے، اگر وہ اس تہذیب کو اختیار نہیں کرتے تو انکا زندہ رہنا مشکل ہے اور اگر اختیار کرتے ہیں تو اس کے برے نتائج سے بچنا دشوار ہے، چنانچہ آج کوئی ملک و قوم بھی اس سے محفوظ نہیں اور

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہٗ باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

کا معاملہ ہے اسوقت پوری اسلامی دنیا اس دوراہے پر ہے۔

چنانچہ دونوں قسم کے خیالات ساتھ ساتھ چل رہے ہیں ترقی پسند طبقہ مغربی تہذیب کے طلسم میں گرفتار بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کمیونزم کا شکار ہے، لیکن اکثریت علانیہ نہ سہی عقیدۃً اسلام پسند ہے، سعودی عرب کی حالت ان ملکوں سے کسی قدر مختلف ہے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اسلام کا سرچشمہ ہے، اسکے مرکز مکہ مدینہ دونوں سعودی عرب میں ہیں، جس کے اثرات اب بھی باقی ہیں، حرم، کعبہ اور روضۂ نبوی کے سامنے پہنچکر تھوڑی دیر کے لئے بڑے بڑے ترقی پسند ترقی پسندی کو بھول جاتے ہیں، اور ان کی گردنیں بے اختیار ان کے سامنے خم ہو جاتی ہیں، جس کا مشاہدہ ہر شخص کر سکتا ہے، دوسرے سعودی عرب کا علاقہ اب سے چند سال پہلے تک مغربی تہذیب کے دو اہم عناصر یعنی دولت اور جدید تعلیم سے محروم تھا، اس لئے اس کا سایہ سعودی عرب پر بہت کم پڑا مگر اب پٹرول اور صنعتی منصوبوں کی وجہ سے امریکہ اور یورپ سے سعودی حکومت کے روابط پیدا ہو گئے ہیں، ان کی آمد و رفت اور جدید تعلیم کی اشاعت سے مغربی تہذیب کے اثرات پڑنے لگے ہیں، مگر یہ غنیمت ہے کہ ابھی یہ اثرات معاشرت تک محدود ہیں، عقائد و افکار اس سے محفوظ ہیں لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ چیز کب تک

قائم رہے گی۔

ان حالات میں جو کچھ امید ہے وہ ملک فیصل کی دین داری سے ہے، روشن خیالی کے باوجود مذہبی حکمران ہیں اور اس زمانہ میں صرف سعودی عرب اور لیبیا ایسے ملک ہیں، جہاں اسلامی قوانین نافذ ہیں وہ نہ صرف اپنے ملک کی تعمیر اسلامی بنیادوں پر چاہتے ہیں بلکہ اتحاد اسلامی اور مسلمانوں کی دینی اصلاح کے بہت بڑے داعی بھی ہیں، اس کے لیے انھوں نے اپنے سارے وسائل وقف کر دیے ہیں، مکہ میں الرابطۃ الاسلامیہ کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے، ہر سال پابندی کے ساتھ اس کے جلسے ہوتے ہیں جن میں پوری دنیائے اسلام کے علما و مفکرین جمع ہوتے ہیں اور اس کے سارے مصارف سعودی حکومت برداشت کرتی ہے، اسلامی سکریٹریٹ میں اگرچہ سارے اسلامی ملک شریک ہیں لیکن اس کے روح رواں بھی ملک فیصل ہیں اور اس کا مرکز جدہ ہے، انھوں نے ایشیا اور افریقہ کے مختلف اسلامی ملکوں کا دورہ کرکے ان میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی، اور یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف عرب بلکہ اسلامی ملکوں کو بڑی حد تک اتحاد اسلامی کے رشتہ میں منسلک کر دیا اور ان ملکوں کو بھی جن کو عربوں سے اختلاف بلکہ ایک گونہ مخالفت تھی ہم نوا بنا لیا عجب نہیں کہ اسلامی مفکرین اور مصلحین نے اتحاد اسلامی اور مسلمانوں کی دینی تجدید و اصلاح کا جو خواب دیکھا تھا۔ وہ ملک فیصل کے ذریعہ پورا ہو،

آخیر میں ایک چیز کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے، جو ہر شخص کی نگاہ میں کھٹکتی ہے۔ سعودی عرب کے تعمیری اور صنعتی منصوبوں کے باوجود ابھی وہ جملہ ضروریات زندگی میں یورپ کا محتاج ہے مکہ مدینہ اور جدہ وغیرہ کے بازار بیرونی ملکوں کے

سامانوں سے پٹے ہوئے ہیں، ان میں ملکی کوئی چیز مشکل ہی سے نظر آتی ہے، دولت کی فراوانی نے اور بھی سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے، معیار زندگی اتنا بلند ہوگیا ہے کہ ہندوستان میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، معمولی مزدور کی ماہوار تنخواہ پانچ چھ سو ریال سے کم نہیں، یعنی ہندوستانی سکہ کے حساب سے ہزار بارہ سو ماہوار، معمولی معمولی لوگوں کے پاس اتنی شاندار موٹریں ہیں کہ ہندوستان کے بڑے بڑے لوگوں کو نصیب نہیں، مکانات غیر ملکی سامان آرایش سے آراستہ ہیں، جانماز، رومال اور تسبیح تک جن کو حاجی تبرک لاتے ہیں دوسرے ملکوں سے آتی ہیں، تسبیح بمبئی سے جاتی ہے، خالص عرب کا تحفہ صرف کھجور ہے،

ضرورت اس کی ہے کہ غیر ملکی مال پر پابندی لگائی جائے۔ اور جہاں تک ہوسکے ضروریات زندگی سعودی عرب یا اسلامی ملکوں سے حاصل کی جائیں، ورنہ امریکہ اور یورپ پٹرول کے معاوضہ میں ایک ہاتھ سے جو کچھ دیتے ہیں وہ دوسرے ہاتھ سے واپس لے لیتے ہیں۔

حدیث کا درایتی معیار

از جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دین و شریعت سے متعلق جو کچھ منسوب ہو اسکو "حدیث" کہتے ہیں، اس نسبت کی صحت کو جانچنے کے لیے اہل علم نے ایک معیار مقرر کیا ہے، جس کا نام "درایتی معیار" ہے۔

درایت کے لغوی معنی — لغت میں درایت کے معنی "معرفت" ہیں۔[۱]

حدیث کی صحیح معرفت اُسی صورت میں ممکن ہے جب کہ راوی (حدیث نقل کرنے والا) اور مروی (حدیث) دونوں سے متعلق پوری معلومات ہوں یعنی راوی کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ کہاں اور کب پیدا ہوا؟ اس کا حافظہ قوی تھا، یا کمزور، نظر سطحی تھی یا گہری، ثقہ تھا یا غیر ثقہ، جاہل تھا یا عالم، اخلاق و کردار کیسے تھے؟ ذرائع معاش اور مشاغل کیا تھے؟ روایت کرنے میں مقررہ شرطوں کا لحاظ کیا ہے یا نہیں؟ اسی طرح مروی کے بارے میں معلوم ہو کہ اس کے الفاظ و جملوں میں کسی قسم کی خامی و کمزوری یا مقررہ قواعد کی خلاف ورزی تو نہیں پائی جاتی ہے، معانی و مفہوم میں عقل، مشاہدہ، تجربہ، زمانہ کے طبعی تقاضے، کسی مسلمہ اصول اور قرآنی تصریحات کی خلاف ورزی تو نہیں لازم آتی ہے جن سے کسی طرح بھی شان نبوت پر حرف آئے یا فرمودات نبوی میں سطحیت ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو۔

درایت کی اصطلاحی تعریف دو طرح منقول ہے۔

[۱] راغب اصفہانی المفردات فی غرائب القرآن، محمد بن مکرم انصاری لسان العرب،

(۱) عام اور (۲) خاص "عام" وہ ہے جس کا تعلق راوی اور مروی دونوں کی معرفت سے ہو، اور "خاص" وہ ہے جس کا تعلق صرف "مروی" کی معرفت سے ہو۔

درایت کی عام اصطلاحی تعریف — عام کے تحت تین قسم کی تعریفیں آتی ہیں۔ مثلاً

طاہر بن صالح الجزائری الدمشقی کہتے ہیں۔

علم درایۃ الحدیث علم یتعرف منه انواع الروایة واحکامها وشروط الرواۃ واصناف المرویات واستخراج معانیها۔[۲]

درایت حدیث وہ علم ہے جس سے راوی کی شرطیں، روایت کی قسمیں اور اس کے احکام کی معرفت ہوتی ہے نیز مرویات کی قسمیں اور ان کے معانی کے استخراج کا علم ہوتا ہے۔

ابن الاکفانی اور جلال الدین السیوطی نے بھی تقریباً یہی الفاظ میں[۳]

عز الدین بن جماعۃ کہتے ہیں۔

علم الحدیث درایۃ علم بقوانین یعرف بها احوال السند والمتن۔[۴]

درایتی علم حدیث ان قوانین کے جاننے کو کہتے ہیں جن کے ذریعہ سند اور متن کے احوال کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

زین الدین بن علی کہتے ہیں۔

[۲] طاہر بن صالح، احمد الجزائری الدمشقی توجیہ النظر الی اصول الاثر الفائدۃ الثالثۃ۔ [۳] ارشاد المقاصد از مقدمہ تحفۃ الاحوذی (عبد الرحمن مبارکپوری) الباب الاول الفصل الاول۔ جلال الدین السیوطی تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی مقدمۃ المؤلف [۴] نور الدین عتر المدخل۔ مقدمہ علوم الحدیث لابن الصلاح

درایۃ الحدیث وھو علم	درایت حدیث وہ علم ہے جس میں حدیث
یبحث فیہ عن متن الحدیث	کے متن اور اس کی سند سے بحث ہوتی
وطرقہ من صحیحھا وسقمھا	اور حدیث کی صحت وسقم کا پتہ چلتا ہے،
وعلمھا وما یحتاج الیہ[1]	جن چیزوں کی معلومات ضروری ہیں
	ان کے متعلق علم ہوتا ہے۔

درایت کی خاص اصطلاحی تعریف "خاص" کے تحت یہ تعریفیں ہیں مثلاً طاش کبری زادہ کہتے ہیں۔

ھو علم باحث عن المعنی	درایت حدیث وہ علم ہے جس میں
المفھوم من الفاظ الحدیث	الفاظ حدیث سے سمجھے گئے مفہوم
وعن المراد منھا مبنیا علی	و مراد سے بحث ہوتی ہے جب کہ
قواعد العربیۃ وضوابط	وہ عربی قواعد و شرعی ضوابط پر
الشریعۃ ومطابقا لاحوال	مبنی اور رسول اللہ کے احوال کے
النبی صلعم[2]	مطابق ہوں۔

حاجی خلیفہ (صاحب کشف الظنون) اور نواب صدیق حسن خان سے بعینہٖ یہی تعریف منقول ہے۔[3]

اس کی تائید درایت کے "موضوع" سے بھی ہوتی ہے۔

[1] زین الدین بن علی بن محمد شرح البدایہ فی علم الدرایہ (مخطوطہ آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)، [2] طاش کبری زادہ مفتاح السعادہ اور مفتاح السیادہ درایۃ الحدیث۔ [3] حاجی خلیفہ۔ کشف الظنون ج ۱۔ علم الحدیث نواب صدیق حسن خان ابجد العلوم ج ۲ علم الحدیث الشریف،

وموضوعھا احادیث الرسول	رسول اللہ کی حدیثیں مفہوم یا
صلعم من حیث دلالتھا	مراد پر ان کی دلالت کی حیثیت سے
علی المفھوم او المراد[5]	درایت کا موضوع ہیں،

علم درایت کے اصلاً دو جز ہیں، مذکورہ مختلف تعریفوں سے ظاہر ہے کہ علم درایت کے اصلاً دو جز ہیں۔

(۱) نقد حدیث اور (۲) فہم حدیث

نقد حدیث کے دو پہلو ہیں پھر نقد حدیث کے دو پہلو ہیں۔ (الف) خارجی نقد اور (ب) داخلی نقد۔

خارجی نقد میں راوی کے احوال کے لحاظ سے حدیث کی تحقیق و درجہ بندی ہوتی ہے۔ اور داخلی نقد میں الفاظ، معانی اور مفہوم کے لحاظ سے حدیث کی تحقیق و محل کی تعیین ہوتی ہے۔

فہم حدیث کے دو پہلو ہیں، اسی طرح فہم حدیث کے بھی دو پہلو ہیں۔

(الف) خارجی فہم اور (ب) داخلی فہم اور

خارجی فہم میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ حدیث کے مفہوم میں وقتی حالات، مقامی اثرات اور زمانی خصوصیات کو کس حد تک دخل ہے؟ داخلی فہم میں دیکھا جاتا ہے کہ حدیث کے مفہوم اور موقع و محل کی تعیین میں کن مقاصد کا لحاظ ضروری اور کس وقت کن کو مقدم یا مؤخر کرنے کی گنجائش ہے؟

وہ پہلو جن پر کام کی شدید ضرورت ہے، نقد حدیث کے خارجی پہلو (خارجی نقد) پر تو کام ہو تا رہا ہے،

[5] کشف الظنون ج ۱۔ علم الحدیث

لیکن اس کے داخلی پہلو اور فہم حدیث کے دونوں پہلوؤں پر کام کا تسلسل نہیں جاری رہ سکا جس کی وجہ سے حدیث کی شناخت اور اس کے محل کی تعیین میں دشواری پیش آتی رہی اور حدیث کی افادیت گویا ایک ساتھ محدود ہوگئی۔ حالانکہ ان پہلوؤں پر کام سے بڑے قیمتی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً

(۱) "داخلی نقد" سے حدیث الفاظ و معانی کی مختلف کمزوریوں سے پاک ہوکر اپنی اصل ہئیت و عظمت برقرار رہتی ہے۔ (۲) "خارجی" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کس حدیث سے روح اور قالب دونوں مقصود ہیں، اور کس کی صرف روح مقصود ہے، اور "قالب" حالات کی تبدیلی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

(۳) داخلی فہم سے حکمتوں اور مصلحتوں کی یافت ہوتی ہے۔ جن سے احکام و مسائل کے استخراج و استنباط کی راہیں کھلتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ خارجی نقد کی طرح اگر ان "فوائد" کو بھی حاصل کرنے کی کوشش مسلسل جاری رہتی تو نہ حدیث کی افادیت مجروح ہوتی اور نہ اس کو ایک دور کے ساتھ محدود کرنے کی کسی کو جرأت ہوتی۔

نقد حدیث پر مستشرقین کا کام

"نقد حدیث" پر مستشرقین نے بھی کام کیا ہے جن میں گولڈ سیہر (Golt Siher) اور جوزف شاخت (Joseph Schacht) کو نمایاں حیثیت حاصل ہے گولڈ سیہر کو تو مغرب میں "نقد حدیث" کا بانی سمجھا جاتا ہے اور جوزف شاخت اس کا لائق شاگرد ہے جس نے استاد کے کام کو تقویت پہنچا کر اس کے کام کو آگے بڑھایا ہے۔ ان دونوں نے ذہین اور تعلیم یافتہ طبقہ کو (جس کی بنیاد دین مضبوط نہیں ہے) زیادہ متاثر کیا ہے اس بنا پر جدید دور میں

درایت حدیث کی بحث اس وقت تک نامکمل سمجھی جاتی ہے، جب تک نقد حدیث پر مستشرقین کے کام کا جائزہ نہ لیا جائے۔

پھر درایت کا گہرا تعلق "ماخذ حدیث" سے ہے جس کی معرفت کے بغیر درایت کی ہر بحث نامکمل رہتی ہے۔ ایسی صورت میں پہلے حدیث کے ماخذ کا ذکر ضروری ہے۔

درایتی معیار کے پانچ اہم مباحث

اس طرح "درایتی معیار" پر گفتگو کے لئے پانچ اہم عنوان قرار پاتے ہیں۔

(۱) حدیث کا ماخذ۔ (۲) داخلی نقد حدیث (۳) خارجی فہم حدیث۔ (۴) داخلی فہم حدیث اور (۵) نقد حدیث کا جائزہ

آئندہ سطور میں ہر ایک کی تفصیل درج ذیل ہے۔

حدیث کا ماخذ

"حدیث کا ماخذ" SOURCE (سرچشمہ) شعور نبوت ہے۔ اس سے مراد علم و حکمت کا "نور" اور فہم و ادراک کا وہ "کمال" ہے جو انبیاء علیہم السلام کو اللہ کی جانب سے عطا ہوتا ہے۔ یہ شعور نبوت کے خلقی وجدان کا نتیجہ اور اس کے لیے لازم ہے۔ جن کے بغیر نبوت کے فرائض انجام دینے کی کوئی شکل نہیں ہے۔

شعور نبوت کا ثبوت

قرآن حکیم کی اس آیت سے "شعور نبوت" کا ثبوت ملتا ہے۔

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ[1]

اے نبی، ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو دکھایا۔

[1] النساء، رکوع ۱۵۔

بِمَا أَرَاكَ اللّٰهُ کی تفسیر مفسرین سے یہ منقول ہے۔

بما عرفك واوحى به اليك[1]	اس کے مطابق جس کی اللہ نے آپ کو معرفت دی اور آپ کی طرف وحی بھیجی۔
بما اعلمك الله[2]	اس کے مطابق جیسا اللہ نے آپکو علم دیا۔

امام فخر الدین رازی نے مذکورہ آیت میں "علم" کو "رویۃ" سے تعبیر کرنے کی یہ وجہ بیان کی ہے۔

لان العلم المبرا عن جهات الريب يكون جاريا مجرى الرواية في القوة والظهور[3]	وہ علم یقینی جو شک کو دور کرنے والا ہے، قوت اور ظہور میں رویت (دیکھنے) کے قائم مقام ہوتا ہے۔

پھر حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

لايقولن احد قضيت بما اراني الله تعالى فان الله تعالى لم يجعل ذالك الا للنبي واما احدنا فرأيه يكون ظنا لا علما[4]	کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میں نے اس کے مطابق فیصلہ کیا جو اللہ نے مجھے دکھایا، کیونکہ یہ مقام صرف نبیؐ کے لیے خاص ہے۔ ہم لوگوں کی رائے ظن کے درجہ میں ہوتی ہے نہ کہ علم کے درجہ میں

ظاہر ہے کہ رویت سے مراد یہاں بصری روایت نہیں ہے بلکہ قلبی روایت ہے[5]

۱؎ قاضی بیضاوی تفسیر بیضاوی سید محمود آلوسی۔ روح المعانی نساء ع ۱۵ ۳؎ فخر الدین رازی تفسیر کبیر جزء ثالث نساء ع ۱۵ ۴؎ ایضاً ۵؎ ایضاً و محمد عبدہ المنار جزء خامس۔

جس کی اللہ کی طرف نسبت ہے اور یہ خصوصیت صرف "شعور نبوت" کو حاصل ہوتی ہے۔

حکمت کا مفہوم | شعور نبوت کو سمجھنے کے لیے حکمت اور اس کے مقام کی نشاندہی ضروری ہے۔

قرآن حکیم کی کئی آیتوں میں "حکمت" کا ذکر ہے لغت میں اس کے یہ معنی ہیں۔

الحكمة اصابة الحق بالعلم والعقل[1] الحكمة عبارة عن معرفة افضل الاشياء بافضل العلوم[2]	علم و عقل کے ذریعہ حق کو پہنچنے کا نام حکمت ہے۔ افضل اور بہتر چیز کو بہترین علم کے ذریعہ جاننا حکمت ہے۔

مفسرین سے یہ معنی منقول ہے۔

(۱) ہر شے کو اس کے مناسب محل میں رکھنے کی صلاحیت "وضع كل شىء موضعه"

(۲) حقائق اشیا کی معرفت "معرفة الاشياء بحقائقها"

(۳) حق و باطل کے درمیان فیصلہ کی قوت "الفصل بين الحق والباطل"

(۴) قول اور عمل میں صحیح رائے تک پہنچنا "الاصابة في القول والعمل"[3]

(۵) وہ معارف و احکام جن سے نفوس انسانی کمال کو پہونچیں "ما يكمل نفوسهم من المعارف والاحكام"

ان کے علاوہ بھی بہت سے معنی مفسرین سے منقول ہیں۔ مثلاً

(۶) انوار قلوب کی معرفت اور اسرار عیوب سے واقفیت۔

(۷) نفس اور شیطان کی دقیقہ رسی سے آگاہی۔

۱؎ راغب اصفہانی۔ مفردات القرآن۔ ۲؎ محمد بن مکرم انصاری لسان العرب ۳؎ علاء الدین علی تفسیر خازن ص ۹۶ ۴؎ قاضی ثناء اللہ تفسیر مظہری ص ۳۷۱

(۸) شیطانی اور انسانی تقاضوں میں امتیاز کی قوت۔

(۹) عقل کی رہنمائی اور قلب کی بصیرت۔

(۱۰) برائیوں کی صحیح نشاندہی کے بعد علاج کی صحیح تدبیریں۔

(۱۱) مخلوق کے احوال کا علم

(۱۲) خاص قسم کی فراست (قیافہ شناسی) [۱]

ابن مسکویہ (فلسفی) نے حکمت کے تحت یہ چیزیں بیان کی ہیں۔

"ذکاوت و ذہانت، سرعت فہم، قوت فہم، ذہن کی صفائی، عقل کی رسائی اور سہولت تعلّم"

پھر اس کے بعد کہا ہے۔

وبھذہ الاشیاء یکون حسن الاستعداد الحکمۃ [۲]	ان ہی چیزوں کے ذریعہ حکمت کی حسن استعداد پیدا ہوتی ہے

مجاہد تابعی اور امام مالک سے یہ معنی منقول ہیں۔

انہا معرفۃ الحق والعمل بہ و الاصابۃ فی القول والعمل [۳]	حکمت نام ہے حق کی معرفت اس پر عمل اور قول و عمل میں درستی کو پہنچنے کا۔

ابن قیم نے اس "معنی" کو احسن قرار دیا ہے۔

واحسن ما قیل فی الحکمۃ [۴]	حکمت کے باب میں جو کچھ کہا گیا ان میں یہ احسن ہے۔

ان تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ "حکمت" دراصل اسی "استعداد" کا نام ہے جس کے ذر

۱؎ عرائس البیان فی حقائق القرآن ص ۲۰۱ ۲؎ ابن مسکویہ۔ تہذیب الاخلاق ص ۳۰۳ ۳؎ ابن القیم مدارج السالکین و تفسیر قیم و انزل اللہ الخ ص ۲۲۲ (مرتب محمد اویس ندوی)

حق کی معرفت، فیصلہ کی قوت کسی اور شے کو اس کے مناسب محل میں رکھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

حکمت "علم و فہم کا نہایت اونچا درجہ ہے"

قرآن حکیم کی جن آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کی تفصیل بیان کی گئی ہے، ان میں حکمت کو علم و فہم کا نہایت اونچا درجہ تسلیم کیا گیا ہے۔ مثلاً

(۱) تلاوت آیات۔ وہ درجہ جو ذکر و نصیحت حاصل کرنے کے لیے کافی ہے۔

(۲) تعلیم کتاب۔ وہ درجہ جس میں موقع و محل کے لحاظ سے مفہوم متعین کرنے اور اصول و کلیات کو بر محل منطبق کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

(۳) تعلیم حکمت۔ وہ درجہ جس میں بات کی تہہ تک پہنچنے اور اس کے اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کرنے کی "حسن استعداد" پیدا ہوتی ہے۔ "تزکیہ کا تعلق عمل سے ہے" جو ہر درجہ میں یکساں ضروری ہے۔

کمال حکمت ساتھ نورانی شعاع کی آمیزش

غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ نبوت درجۂ کمال کی حکمت پر فائز ہوتی ہے۔ اسی بنا پر قرآن حکیم میں لفظ "حکمت" کی تفسیر اکثر و بیشتر نبوت و سنت سے کی جاتی ہے۔

ابن قیم کہتے ہیں۔

الحکمۃ فی کتاب اللہ نوعان	اللہ کی کتاب میں حکمت دو طرح مستعمل ہے
مفردۃ ومقترنۃ بالکتاب	(۱) مفرد اور (۲) کتاب کے ساتھ۔
فالمفردۃ فسرت بالنبوۃ و	(۱) مفرد کی تفسیر نبوۃ اور علم قرآن کے
فسرت بعلم القرآن قال	ساتھ کی گئی ہے۔ ابن عباسؓ نے کہا کہ

اردو	عربی
وہ علم قرآن ہے یعنی ناسخ ومنسوخ،	ابن عباس ھی علم القران
محکم ومتشابہ، مقدم ومؤخر اور حلال	ناسخه ومنسوخه ومحکمه
وحرام وغیرہ ضحاک نے کہا وہ قرآن	ومتشابهه ومقدمه
علم اور فقہ ہے ضحاک کی دوسری روایت	ومؤخره وحلاله وحرامه
میں اس سے مراد قول اور فعل میں درستی	وامثاله وقال الضحاک
کو پہنچنا ہے، نخعی نے کہا کہ چیزوں کے	ھی القران والعلم والفقه
معانی اور ان کا فہم ہے حسن نے کہا	وفی روایة اخری عنه ھی
اللہ کے دین میں پرہیزگاری مراد ہے	الاصابة فی القول والفعل
گویا یہ تفسیر اس کے ثمرہ اور مقتضاء کے	وقال النخعی ھی معانی الا
لحاظ سے ہے، (۲) جو حکمت کتاب کے	الاشیاء فهمها وقال الحسن
ساتھ ہے اس سے سنت مراد ہے امام	الورع فی دین الله کانه
شافعی اور دوسرے ائمہ نے یہی کہا ہے،	فسرها بثمرتها ومقتضاها
بعضوں نے "وحی" کے مطابق فیصلہ مراد	واما الحکمة المقرونة
لیا ہے لیکن سنت کے ساتھ اس کی	بالکتاب فهی السنة کذلک
تفسیر زیادہ عام اور مشہور ہے۔	قال الشافعی وغیره من
	الائمة وقیل فی القضاء
	بالوحی وتفسیرها بالسنة
	اعم واشهر [1]

[1] ابن قیم مدارج السالکین وتفسیر قیم وانزل اللہ ص ۲۲۷،

نبوت میں کمال حکمت کے ساتھ نورانی شعاع کی آمیزش ہوتی ہے جو مشاہدۂ حق سے باطن پر پڑتی اور اس کو روشنی بخشتی ہے۔

شعور نبوت کے تکوینی اجزاء

اس طرح شعور نبوت کے دو اہم جزء ہیں۔ جن سے اس کی تکوین ہوتی ہے۔

(۱) کمال حکمت اور (۲) نورانی شعاع۔

چند آیتوں سے بطور اشارۃ النص ثبوت،

ذیل میں چند آیتیں پیش کی جاتی ہیں جن سے بطور اشارۃ النص شعور نبوت کے اجزاء کا ثبوت ملتا ہے۔

اردو	عربی
اللہ فرشتوں اور انسانوں میں	اللہ یصطفی من الملئکة
رسول خود منتخب کرتا ہے۔	رسلا ومن الناس [1]

یعنی یہ انتخاب وہبی خصوصیات کی بناء پر ہوتا ہے۔ نہ کہ کسبی خصوصیات کی بناء پر

اردو	عربی
اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت	اللہ اعلم حیث یجعل
کو کس کے سپرد کرے۔	رسالتہ [2]

جس کا انتخاب ہوتا ہے۔ اس کے رجحانات وقلبی میلانات کی بھی نگرانی ہوتی ہے

اردو	عربی
اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو	ولولا ان ثبتنک لقد کدت
کچھ ان کی طرف مائل ہوجاتے۔	ترکن الیهم شیئا قلیلا [3]

اس کا علم خالص اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔

اردو	عربی
اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف	وکذلک اوحینا الیک
اپنے حکم سے قرآن کی وحی کی ورنہ	روحا من امرنا ما کنت

[1] الحج رکوع ۱۰ [2] الانعام رکوع ۱۵ [3] بنی اسرائیل رکوع ۸

تدری ما الکتب ولا	نہ آپ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے
الایمان ولکن جعلنہ	اور نہ ایمان کی تفصیل سے واقف
نورا نہدی بہ من	تھے، لیکن ہم نے اس کو "روشنی" بنایا
نشاء من عبادنا۔[1]	کہ اس کے ذریعہ ہم جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ جس قدر چاہتا ہے غیبی امور کا بھی علم ان کو عطا کرتا ہے۔

وما کان اللہ لیطلعکم	اللہ غیب کی اطلاع نہیں دیتا ہے
علی الغیب ولکن اللہ	لیکن اپنے رسولوں میں سے جسکو
یجتبی من رسلہ من	چاہتا ہے۔ اس کے لیے منتخب
یشاء[2]	کرتا ہے۔

شعور نبوت اور عقل مادی میں ٹکراؤ نہیں ہے۔

جس ذات گرامی کو یہ خصوصیات حاصل ہوں گی وہ لازمی طور سے کمال حکمت کے بلند ترین مقام پر فائز ہوگی اور نورانی شعائیں اس کے جلو میں ہوں گی اور اس کے شعور اور عقل مادی میں کوئی ٹکراؤ نہ ہوگا کیونکہ ٹکراؤ کی صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب داخلی اور خارجی دباؤ (طبعی حجابات اور وضعی حالات) سے حفاظت نہ ہو۔ اور حفاظت صرف ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کے قویٰ میں کمال اعتدال پایا جاتا ہے، جو انبیاء علیہم السلام کے لیے خاص ہے اور جس کی بناء پر من جانب اللہ ان کی حفاظت کا انتظام ہوتا ہے۔

علامہ ابن تیمیہؒ کہتے ہیں۔

[1] الشوری، رکوع ۵، [2] ال عمران رکوع ۱۱۔

ھم متفقون علی انھم	سب اس بات پر متفق ہیں کہ انبیاء
لا یقرون علی خطاء فی	علیہم السلام دین میں کبھی بھی خطا پر
الدین اصلا ولا علی فسق	برقرار نہیں رہ سکتے اور نہ فسق اور
ولا کذب ففی الجملۃ کل	کذب پر، خلاصہ یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو نبوت
مایقدح فی نبوتھم و	اور تبلیغ میں خرابی پیدا کرنے انبیاء
تبلیغھم عن اللہ تعالیٰ	کے اس سے منزہ اور پاک ہونے
فھم متفقون علی تنزیھھم[1]	پر سب کا اتفاق ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کہتے ہیں۔

واجتہادہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ کا اجتہاد بمنزلہ وحی ہے
بمنزلۃ الوحی لان	کیونکہ اللہ نے آپ کو غلط رائے
اللہ تعالیٰ عصمہ من	پر قائم رہنے سے محفوظ رکھا
ان یتقرر رایہ علی	ہے۔
الخطاء[2]	

"عقبات" میں ہے۔

لکن ھذہ الناحیۃ مختصۃ	لیکن حفاظت کی یہ قسم انبیاء علیہم السلام
بالنبی المعصوم الذی	کے ساتھ خاص ہے۔ جن کی مہد سے
یعصمہ من المھد الی اللحد[3]	لیکر لحد تک حفاظت ہوتی ہے۔

[1] ابن تیمیہ منہاج السنۃ ج ۱ فصل الرد علی مازعمہ (مقالۃ السنۃ فی عصمۃ الانبیاء) [2] ولی اللہ حجۃ البالغہ ج ۱ باب بیان اقسام علوم النبیؐ [3] شاہ اسمٰعیل شہید: عبقات عبقہ ۲۰

شعور نبوت دین و شریعت سے متعلق حدیثوں کا سرچشمہ ہے

شعور نبوت ان سب حدیثوں کا سرچشمہ ہے جو دین و شریعت سے متعلق رسول اللہ کی طرف منسوب ہیں، امام شافعی نے ان کی تین قسمیں کی ہیں۔

(۱) ما انزل اللہ عز و جل فیہ نص کتاب فسنّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثل نص الکتاب	(۱) قرآن میں جس طرح کوئی حکم صراحۃً نازل کیا گیا رسول اللہ نے اسی طرح اس کی تفسیر فرمائی۔
(۲) ما انزل اللہ فیہ جملۃ کتاب فبین عن اللہ معنیٰ ما اراد۔	(۲) قرآن میں جو بات مجمل ہے رسول اللہ صلعم کی طرف سے اس کی مراد و تفصیل کو بیان کیا،
(۳) ما سنّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مما لیس فیہ نص کتاب[۱]	(۳) رسول اللہ صلعم نے وہ سنتیں قائم کیں جن کا صراحۃً ذکر قرآن میں نہیں ہے۔

شاطبیؒ کہتے ہیں۔

السنۃ راجعۃ فی معناها الی الکتاب فھی تفصیل مجملہ و بیان مشکلہ و بسط مختصرہ[۲]	"سنت" اپنے معنی و مفہوم کے لحاظ سے قرآن ہی کی طرف رجوع ہونے والی ہے، وہ (سنت) قرآن کے مجمل کی تفسیر مشکل کا بیان اور مختصر کی ۲

۱ امام شافعی کتاب الرسالہ باب ما ابان اللہ ۲ شاطبیؒ الموافقات جزو رابع المسألۃ الثالثۃ

ابن قیم کہتے ہیں۔

والسنۃ مع القرآن ثلثۃ اوجہ احدھا ان تکون موافقۃ لہ من کل وجہ فیکون توارد القرآن و السنۃ علی الحکم الواحد من باب توارد الادلۃ وتظافرھا الثانی ان تکون بیانا لما ارید بالقرآن و تفسیراً لہ الثالث ان تکون موجبۃ لحکم سکت عن ایجابہ او محرمۃ لما سکت عن تحریمہ ولا تخرج عن ھذہ الاقسام فلا تعارض للقرآن بوجہ[۱]	قرآن کو ساتھ سنت کا تعلق تین طرح ہے (۱) سنت قرآن کے پوری طرح موافق ہو یعنی جو حکم اسمیں ہو وہی اس میں ہو یہ توارد ایسا ہی ہو جیسے ایک حکم پر مختلف دلیلوں کا جمع ہو جانا (۲) سنت قرآن کے حکم کی تشریح و توضیح کرتی ہے (۳) سنت کسی واجب یا حرمت کو ثابت کرتی ہو جس سے قرآن نے سکوت اختیار کیا ہو سنت کی کوئی قسم ان تینوں سے خارج نہیں ہو اور ان میں سے کوئی بھی کسی حیثیت سے قرآن کے معارض نہیں ہے۔

دین و شریعت سے متعلق حدیثیں قرآن کی علمی و عملی تشریح ہیں

دین و شریعت سے متعلق حدیثیں دراصل قرآن ہی کی علمی و عملی تشریح ہیں جس کا ثبوت ان آیتوں سے ملتا ہے۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون[۲]	اور ہم نے آپ پر الذکر (قرآن) نازل کیا تاکہ جو چیز لوگوں کی طرف بھیجی گئی ہے آپ انکے سامنے بیان کر دیں اور تاکہ وہ لوگ

۱ ابن قیم اعلام الموقعین ج ۲ البحث الزیادۃ علی القرآن نسخ المثال الثامن عشر ۲ النحل ع

یاایھا الرسول بلغ ما انزل	اے رسولؐ جو کچھ آپؐ پر آپکے رب کی طرف سے
الیک من ربک [1]	نازل کیا گیا ہے، آپ اسکی تبلیغ کیجئے۔
انک لعلیٰ خلق عظیم [2]	بے شک آپ خلق عظیم پر ہیں۔

پہلی آیت میں رسول اللہ کو مبین (شارح) اور دوسری میں مبلغ بتایا گیا ہے۔ بیان و تبلیغ کی صورت یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قول و فعل سے اور کبھی مروجہ طریقوں کو برقرار رکھکر قرآن کے مطالب و مقاصد کی وضاحت فرماتے تھے، تیسری آیت میں آپ کو خلق عظیم پر فائز بتایا گیا ہے، جس میں قول و فعل اور اقرار سبھی داخل ہیں، جن کو حدیث کی تعریف شامل ہے۔

لقد من اللہ علی المومنین	بلاشبہ مومنوں پر بڑا احسان ہوا کہ ان میں
اذ بعث فیھم رسولا منھم	ایک رسولؐ بھیجا جو ان ہی میں سے ہو، اللہ کی
یتلوا علیھم ایتہ ویزکیھم	آیتیں تلاوت کرتا، برائیوں سے پاک صاف کرتا ہے
ویعلمھم الکتب والحکمۃ [3]	اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

یعنی تلاوت آیات میں قرآن اور تعلیم کتاب و حکمت اور اصلاح سے متعلق جس قدر حدیثیں ہیں، وہ سب رسول اللہؐ کے کام کی تفصیلات اور قرآن کی علمی و عملی تشریحات ہیں۔

علمی و عملی تشریح کی چند مثالیں: ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں، جن سے تشریحات نبویؐ کی نوعیت ظاہر ہوگی۔ اور یہ ثابت ہوگا کہ اس نوعیت کا کام شعور نبوتؐ کے بغیر نہیں انجام پا سکتا۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے اصلاحی الفاظ ایمان، اسلام، صلوٰۃ،

[1] المائدہ ع ۱۰، [2] القلم رکوع ۱، [3] آل عمران رکوع ۱۷،

زکوٰۃ، صوم، حج، قربانی اور جہاد وغیرہ کا مفہوم متعین کیا اور ان کی صحیح عملی کیفیت بیان کی،

(۲) غیر اصطلاحی الفاظ کے معنی بیان کئے مثلاً الذین امنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم [1] جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان میں ظلم کو نہیں ملایا، میں ظلم کے معنی شرک بیان کئے ہیں۔

(۳) جملوں کی تشریح کی جیسے کلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود [2] میں خیط ابیض اور خیط اسود سے رات کی تاریکی اور دن کی سفیدی مراد لی، پھر بعد میں "من الفجر" کا نزول ہوا،

(۴) آیتوں کی وضاحت کی مثلاً اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ [3] (انھوں نے اللہ کے سوا اپنے عالموں اور درویشوں کو رب بنالیا) کے متعلق فرمایا کہ حقیقۃً رب بنانا نہیں مراد ہے بلکہ جائز و ناجائز اور حلال و حرام کرنے میں احبار و رہبان کا حق تسلیم کرنا مراد ہے۔

(۵) آیتوں کے شان نزول بیان کئے مثلاً وعلی الثلثۃ الذین خلفوا (ان تین آدمیوں کی توبہ قبول کی گئی جو پیچھے رہ گئے تھے) [4] میں تین آدمی کعبؓ بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع کی تعیین فرمائی۔

(۶) اشکال کے جواب دیئے مثلاً یا اخت ھرون [5] (اے ہارون کی بہن) فرمایا کہ ہارون سے مراد نبی نہیں بلکہ دوسرا شخص ہے، اسی طرح مرنے کے بعد دوسری زندگی کے بارے میں طرح طرح اشکالات کے جواب دیئے۔

(۷) مجمل آیتوں کی تشریح کی جس کے بغیر صحیح مفہوم سے واقفیت دشوار تھی، مثلاً معروف، منکر، طیبات اور خبائث وغیرہ کی تفصیل

[1] انعام ۹ - [2] بقرہ - ۲۳ - [3] توبہ - ۴ - [4] ایضاً - ۱۴ [5] مریم - ۲۰ -

(۸) مطلق آیتوں کو موقع و محل کے لحاظ سے مقید کیا، مثلاً جرائم کی سزاؤں سے متعلق آیتوں پر عمل درآمد کی تفصیل بیان کی۔

(۹) احکام کی شرطیں، رکاوٹیں، اور قیدیں وغیرہ بیان کیں جن کے بغیر ان پر عمل دشوار تھا۔ مثلاً نکاح، طلاق، خرید و فروخت وغیرہ معاملات کی تفصیل۔

(۱۰) نئے احکام بیان کئے جن کا صریح ذکر اگرچہ قرآن میں نہیں ہے لیکن وہ اس سے مستنبط ہوتے ہیں، مثلاً پھوپھی کی موجودگی میں بھتیجی سے نکاح یا خالہ کی موجودگی میں بھانجی سے نکاح وغیرہ۔

(۱۱) جزئی احکام کے موقع و محل متعین کئے جیسے تیمم و نماز قصر کے مواقع اور شرعی رخصتوں کے فعل وغیرہ

(۱۲) اصول و کلیات کو مثال کے ذریعہ واضح کیا جس سے قیاس و استنباط کی راہیں کھلیں، مثلاً پالتو گدھے، دانتوں سے شکار کرنے والے درندے اور پنجہ سے شکار کرنے والے پرندوں کو خبائث میں شامل کرکے حرام قرار دیا۔

(۱۳) اصل کو فرع پر منطبق کرکے دکھایا اور اس کے حدود و قیود بتائے جس سے دوسری فرع کا حکم نکالنے میں سہولت ہوئی جیسے مردہ جانور کی حرمت اور ذبیحہ کی حلت کا حکم تو موجود ہے۔ لیکن ذبیحہ کے پیٹ سے جو بچہ نکلے اس کا حکم نہیں معلوم ہے، رسول اللہ نے اس کا حکم بیان کیا۔

(۱۴) جزئیات پر مشتمل عام قاعدہ کی تشکیل کی جس سے مصالح مرسلہ استحسان (فقہ کے دو اہم اصول) میں کام لیا گیا۔ مثلاً

لا ضرر ولا ضرار فی الاسلام[1]	اسلام میں نہ نقصان اٹھانا ہے۔ اور نہ نقصان پہنچانا ہے۔

(۱۵) قرآن حکیم میں جن مصالح و مقاصد کو ملحوظ رکھکر احکام و اصول مقرر کئے۔ رسول اللہ نے ان کو پیش نظر رکھ کر بہت سے جزئی احکام بیان کئے جن سے اجتہاد کا دروازہ وسیع ہوا، اور شرعی احکام کو برمحل منطبق کرتے ہیں سہولت ہوئی۔

شاطبی نے الموافقات جزء ثانی میں نہایت تفصیل کے ساتھ مصالح و مقاصد کی بحث کی ہے، اور راقم کی کتاب مسئلہ اجتہاد پر تحقیقی نظر میں بھی مل جائے گی۔

عقل بشری دنیوی حالات سے متعلق حدیثوں کا سرچشمہ ہے

جیساکہ اوپر کہا گیا ہے شعور نبوت ان حدیثوں کا سرچشمہ ہے، جن کا تعلق دین و شریعت سے ہے، لیکن جو حدیثیں دنیوی حالات و تجربات سے متعلق ہیں۔ ان کا سرچشمہ "عقل بشری" ہے، جن کے بارے میں رسول اللہ نے فرمایا ہے۔

انما انا بشر اذا امرتکم بشیئ من دینکم فخذوا به	میں ایک انسان ہی ہوں جب
من رائی فانما انا بشر[2] مسلم باب	میں تمہارے دین کے بارے میں
وجوب امتثال ما قاله شرعاً	کوئی حکم دوں تو اس کو پکڑو اور
دون ماذکره صلی اللہ علیہ وسلم من معائش	جب اپنی رائے سے کچھ کہوں تو بس
الدنیا	میں انسان ہوں

دوسری روایت میں ہے۔

انتم اعلم باموردنیاکم[3] (ایضاً)	تم اپنے دنیاوی امور کو زیادہ جانتے ہو۔

تیسری روایت میں ہے۔

---

[1] مسلم ابواب البیوع [2] ایضاً [3] ایضاً

انی ظننت ظنا فلا تواخذونی بالظن ولکن اذا حدثتکم عن اللہ شیئاً فخذوا بہ فانی لا اکذب علی اللہ (مسلم باب وجوب امتثال ما قالہ شرعاً دون ما ذکرہ صلی اللہ علیہ وسلم من معایش الدنیا علی سبیل الرأی)

میں نے گمان سے ایک بات کہی تھی تم ان باتوں کو (شرعی حیثیت سے) نہ لو لیکن جب میں اللہ کی طرف سے کچھ کہوں تو اس کو لے لو میں اللہ پر کبھی کوئی جھوٹی بات نہیں کہتا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ تشریف لانے کے بعد باغبانوں کو کھجور کی پیداوار کے بارے میں ایک مشورہ دیا تھا۔ (تابیر نخیل کے منع فرمایا تھا) لوگوں نے اس پر عمل کیا۔ لیکن وہ مفید نہ ثابت ہوا۔ اس پر رسول اللہ نے مذکورہ بالا الفاظ فرمائے، درایتی معیار کا اصل تعلق شعور نبوت سے ہے، اس بنا پر عمل بشری سے متعلق حدیثوں پر گفتگو کی اسوقت ضرورت نہیں ہے۔ (باقی)

تذکرۃ المحدثین

اس میں مولفین صحاح ستہ کے علاوہ دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام مثلاً۔ عبد الرزاق بن ہمام، احمد بن حنبل، دارمی، ابن جارود، ابو الیعلی موصلی، ابن خزیمہ، طحاوی وغیرہ ائمہ حدیث کے حالات وسوانح اور ان کی خدمات حدیث کی تفصیل بیان کی گئی ہے، پہلے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے قلم سے مقدمہ پھر اصل کتاب ہے جو صاحب موطا، امام مالک کے حالات سے شروع ہوئی ہے۔

مولفہ:۔ ضیاء الدین۔ اصلاحی

قیمت:۔ آٹھ روپے

انشورنس

(اسلامی نقطۂ نظر سے)

تحریر:۔ ڈاکٹر عبد الرحمٰن تاج

ترجمہ:۔ از۔ مولوی محمد ایوب صاحب اصلاحی استاذ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر،

(یہ مقالہ، قاہرہ میں مجمع البحوث الاسلامیہ کی ساتویں کانفرنس میں پیش کیا گیا تھا)

بیمہ کمپنیوں کے دو کام ہیں (۱) زندگی کا بیمہ کرنا (۲) مال کا بیمہ کرنا اور ان دونوں قسموں کے بیموں کا مقصد جان و مال کے تحفظ و سلامتی کی ضمانت ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ جان و مال کی ہلاکت کے خطروں کو روک دے گا۔ اور ان کی تباہی کے اسباب کو بند کر دے گا۔ کیونکہ یہ تو کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ کہ فرشتۂ اجل کو کوئی روک دے۔ یا جو آفات سماوی نازل ہوں۔ ان کو دور کر دے۔ یہ ایک نہایت ہی لغو بات ہوئے اور بہت بڑی حماقت ہے۔ ان میں سے کسی چیز کے متعلق بھی سلامتی و تحفظ کی ضمانت دیکا یا کسی مدعی کی اس طرح کی احمقانہ ضمانت قبول کی جائے۔

بیمہ کمپنیاں جان یا مال کے تحفظ و سلامتی کی جو ضمانت دیتی ہیں۔ وہ درحقیقت ایک طرح کی مراہنت ہوتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بیمہ کمپنی بیمہ کرتے وقت اپنے ممبروں سے یہ عہد کرتی ہے۔ کہ اگر بیمہ شدہ جان یا مال کو کسی قسم کا ضیاع یا نقصان،

پہونچا تو کمپنی اس نقصان کے معاوضہ میں وہ رقم ادا کرے گی جسے ادا کرنا اس نے اپنے
اوپر لازم کر لیا ہے۔

زندگی کے بیمہ کی شکل یہ ہے کہ ایک شخص کسی مدت معینہ تک کے لئے ایک مقررہ
رقم پر کمپنی سے معاہدہ کرتا ہے۔ مثلاً اگر بیس سال کے لئے پانچ ہزار پونڈ طے پایا ہے
تو یہ شخص اس معاہدہ کی رو سے کمپنی کو مقررہ شرائط کے مطابق ماہانہ قسطوں میں
یہ رقم ادا کرتا رہے گا۔ اگر یہ شخص مقررہ مدت تک اپنی جان سلامتی کے ساتھ
بچا لے گیا تو کمپنی اس کی ساری رقم جو اس نے کمپنی کو دی ہے منافع کے ساتھ یا بغیر منافع
کے جیسا کہ طے شدہ شرائط میں ہوگا۔ اسے واپس کر دے گی لیکن اگر وہ شخص متعینہ مدت
کے درمیان ہی میں مر گیا تو کمپنی پوری مقررہ رقم اس کے ورثہ کو یا اس کے مقرر کئے ہوئے
جانشین کو ادا کر دے گی، چاہے مرنے والے نے اپنی زندگی میں بیمہ کی مقررہ رقم
میں سے ایک ہی قسط کیوں نہ ادا کی ہو۔

جسم کے مختلف اعضا کا الگ الگ بیمہ بھی پوری زندگی کے بیمہ جیسا ہے۔

مال کے بیمہ کی شکل یہ ہے کہ ایک شخص بیمہ کمپنی سے ایک معاہدہ کرتا ہے جس کی
رو سے کمپنی اس کے مکان یا موٹر یا اثاثہ یا تجارتی مال جو دوکان میں ہو یا وہ اسے
خشکی یا تری میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر رہا ہو۔ ان کے علاوہ بھی مختلف
چیزوں کے تحفظ کی ذمہ داری لیتی ہے۔ اور مال کا مالک کمپنی کو مقررہ شرائط کے
مطابق ماہانہ یا سالانہ ایک متعین رقم ادا کرتا رہتا ہے۔ اس متعین رقم کی مقدار فریقین
کے درمیان بیمہ شدہ مال کی طے شدہ قیمت کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔

یہ مقررہ رقم، زندگی کے بیمہ کے برخلاف خالصۃً بیمہ کمپنی کی ہوتی ہے۔ مال مالک

کسی حالت میں بھی اسے واپس نہیں لے سکتا۔ البتہ اگر بیمہ شدہ مال پر کوئی آفت آگئی
اور وہ تباہ و برباد ہو گیا تو اس تباہ شدہ مال کی پوری قیمت ادا کرنے کی ذمہ دار
کمپنی ہوگی، اگرچہ مال کے مالک نے بیمہ کی مقررہ رقم کی ادائگی صرف ایک ہی بار
کیوں نہ کی ہو۔

انشورنس کی دونوں قسموں کے بارے میں شرعی حکم

زندگی یا مال کے بیمہ کے موضوع پر علمائے متقدمین کا کوئی
خیال کہیں منقول نہیں ہے۔ اس لئے اس معاملہ کی حرمت
وحلت کے بارے میں ان کے کسی قول سے استناد ناممکن ہے۔ کیونکہ ان کے عہد میں
معاملت کی یہ قسم نہ تو اسلامی حدود مملکت میں کہیں رائج تھی۔ اور نہ اس پاس کے غیر اسلامی ملکوں
ہی میں اس طریقہ کا رواج تھا۔ لیکن اسلامی شریعت کے بنیادی اصول وقواعد، اور
علماء مجتہدین کے استنباط کئے ہوئے شروط وضوابط کی روشنی میں بیمہ کی دونوں قسموں
کے متعلق شریعت کا نقطۂ نظر معلوم کیا جا سکتا ہے اس سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ
بیمہ کی موجودہ شکلیں، اس کے قانونی اثرات اور اس کے وہ معروف ومشہور قیود و
شرائط جن کے مطابق بیمہ کمپنیاں چل رہی ہیں کیا ہیں؟ اور پھر اس کے بعد شریعت
اسلامی کے تفصیلی نصوص، عمومی کلیات اور فقہ اسلامی کے مصادر سے ائمہ مجتہدین کے
استنباط کئے ہوئے قوانین وضوابط کی روشنی میں پوری تدقیق وتحقیق کے ساتھ ان سب کا
جائزہ لیا جائے تو توقع ہے کہ بیمہ کے متعلق شریعت اسلامی کا صحیح حکم معلوم ہو سکے بیمہ کے
علاوہ ان تمام معاملات ومسائل کا بھی یہی حال ہے جن سے گزشتہ زمانہ کے فقہاء کو کوئی
سابقہ پیش نہیں آیا۔

شریعت اسلامی کے بنیادی اصول اور بیمہ کمپنیوں کے مروجہ آئین وضوابط کی بنیاد پر

ہمارا خیال ہے کہ مذکورۃ الصدر شکل میں بیمہ کے تمام معاملات اسلامی شریعت کے نقطۂ نظر سے قطعاً ناجائز ہیں۔ یہاں تک کہ زندگی کے بیمہ میں اس شکل کے جواز کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے، جس میں مدتِ معینہ کے خاتمہ تک زندہ رہنے کی حالت میں صرف اصل رقم جو حسب قرارداد فریقین طے پاچکی تھی۔ واجب الادا ہو۔ اور اس پر کوئی سود بھی نہ لیا جائے کیونکہ یہ معاملت بذاتِ خود فاسد اور فاسد شرطوں پر مشتمل ہے۔ اور اس سے اکل مال بالباطل کی اباحت لازم آتی ہے۔ جو شرعاً ممنوع ہے۔ اور یہی حکم مال کے بیمہ کا بھی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

علامہ ابن عابدین نے درمختار کے حاشیہ پر سوکرہ کے متعلق جس کا ان کے زمانے میں رواج تھا۔ اور جس کے بارے میں ان سے بہت زیادہ سوالات بھی کئے گئے تھے۔ ایک عمدہ بحث کی ہے۔ اس میں انھوں نے مال کے بیمہ کے متعلق شرعی حکم کا استخراج کیا ہے، علامہ نے اس معاملت کی صورت یہ بیان کی ہے کہ "تاجروں کا معمول ہے کہ جب کسی حربی سے کوئی کشتی اجرت پر لیتے ہیں تو اسے اس کی اجرت بھی دیتے ہیں۔ اور مزید ایک مقررہ رقم ایسے دوسرے حربی کو بھی دیتے ہیں۔ جو کشتیبان کے شہر کا رہنے والا ہوتا ہے۔ اس رقم کو (سوکرہ) کہتے ہیں۔ یہ رقم اس لیے دیجاتی ہے کہ کشتی کا مال جل کر یا ڈوب کر تباہ ہوجائے یا راستہ میں لوٹ لیا جائے۔ یا اور کسی طرح برباد ہوجائے تو وہ شخص اس کا ذمہ دار ہوگا۔ اس کام کے لیے اس کا ایک ایجنٹ اسلامی ملک کے کسی ساحلی شہر میں سلطان کی اجازت سے مقیم رہتا ہے اور وہ تاجروں کے ایسے تمام مال جو سوکرہ کے ذریعہ آتے ہیں وصول کرتا ہے۔ اور پھر صاحبِ مال کے حوالہ کرتا ہے اور اگر سمندر میں تاجروں کا کوئی مال ضائع ہوگیا تو وہ ایجنٹ ان تاجروں کو

ضائع شدہ مال کا پورا پورا معاوضہ دیتا ہے۔"

اس کے بعد ابن عابدین لکھتے ہیں کہ "میرے خیال میں اس تاجر کے لیے اپنے ہلاک شدہ مال کا معاوضہ لینا حلال نہیں، کیونکہ یہ "التزام مالا یلزم" ہے یعنی جو چیز شرعاً لازم نہیں ہے۔ اس کا التزام صحیح نہیں ہے۔ اور نہ کسی کو اس کا پابند کرنا صحیح ہے بس کسی مسلمان کے لئے اس کا لینا حلال نہیں۔ اور نہ اس طرح کا معاملہ کرنا درست ہو کیونکہ معاملت کی یہ شکل فاسد ہے۔"

جب یہ اس بیمہ کا حکم ہے۔ جو ایک مسلم اور مستامن کے درمیان ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مستامن دارالاسلام کے قیام کے دوران اپنے تمام معاملات میں اسلامی احکام کی رعایت کا التزام رکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے مال کی حیثیت ذمی کے مال کی حیثیت کی طرح ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا کوئی مال دھوکے یا عقود فاسدہ کے ذریعہ لینا جائز نہیں ہے۔ پس جب اس طرح کا معاملہ ایک مسلم اور مستامن کے درمیان صحیح نہیں ہے تو پھر بیمہ کا وہ معاملہ جو ایک مسلمان اور ذمی کے درمیان ہو یا ایک مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہو، کیونکہ جائز ہوگا؟ یہ تو بہ درجۂ اولیٰ فاسد ہوگا۔ اور اس طرح جو رقم لی جائے گی وہ بہرحال حرام ہوگی۔

مختصر یہ کہ ایک مسلمان کے لئے دھوکا دینا، ناحق کسی کے مال پر قبضہ کر لینا قطعاً ممنوع ہے۔ خواہ فریق ثانی مسلمان ہو یا ذمی ہو یا مستامن ہو۔ ایک مسلمان کے لیے دارالاسلام میں ذمی اور مستامن سے بھی معاملت کی وہی صورت حلال اور جائز ہے جو مسلمانوں کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔

ابن عابدین نے اپنے عہد میں مال کے بیمے کی جو شکل بیان کی ہے۔ اس سے معلوم

ہوتا ہے کہ اس معاہدہ میں ایک طرف مسلمان تاجر ہوتا تھا۔ اور دوسری طرف حربی اور ان دونوں کے بیچ میں ایک مستامن کی درمیانی عنصر کی حیثیت ہوتی تھی۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ ایک مسلمان کے لیے دارالاسلام میں کسی مستامن سے کوئی فاسد معاملت جائز نہیں ہے۔ اور نہ کسی فاسد معاملت کے ذریعہ کسی حربی یا مستامن کا مال لینا حلال ہے۔ اور اگر کسی معاملت میں یہ درمیانی عنصر مستامن کا نہ ہو اور دارالاسلام میں ایک مسلمان اور حربی کے درمیان مراسلت کے ذریعہ بیمہ کی معاملت کی جائے یا دارالحرب میں ان دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہوا ہو جب کہ وہ مسلمان دارالحرب میں مستامن ہو کر داخل ہوا ہو۔ یا ایک حربی اور دوسرے ایسے حربی کے درمیان یہ معاہدہ ہوا ہو جو کسی مسلمان تاجر کا شریک ہو تو خود اس معاملہ کا شرعی حکم کیا ہوگا؟ کیا اس رقم میں سے ایک مسلمان تاجر کے لیے اپنے حربی شریک سے کچھ لینا صحیح ہوگا۔؟ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ دارالاسلام میں کسی مسلمان کے لیے یہ قطعاً جائز نہیں ہے کہ وہ کوئی بھی فاسد معاملت کرے جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔ اس بنا پر اسلامی ملک میں رہتے ہوئے کوئی مسلمان اگر کسی حربی سے مراسلت کے ذریعہ بیمہ کا معاملہ کرے اور بیمے کی رقم بھی دارالحرب میں وصول کرے تو ایسے بیمہ کی رقم بھی حلال نہیں ہے۔ کیونکہ وہ دارالاسلام میں کیے گئے ایک فاسد معاملت کی بنا پر یہ رقم لے رہا ہے۔

البتہ اگر یہ معاملت دارالحرب میں ایک حربی ایک ایسے مسلمان تاجر کے درمیان ہو جو مستامن ہو کر وہاں داخل ہوا ہو تو اس صورت میں یہ اسلامی احکام لاگو نہیں ہوں گے کیونکہ دارالحرب اسلامی احکام کا محل نہیں ہے۔ پس اگر دارالحرب میں یہ معاملت ہو اور وہیں لین دین بھی ہو جائے۔ تو اس مسلمان تاجر کے لیے اس رقم کا لینا جائز ہے۔ کیونکہ ایسی حالت میں ایک حربی کا مال خود حربی کی رضامندی سے لیا جائے گا۔ جو بہر صورت جائز ہے۔ یہاں تک کہ اگر غدر و فریب کا شائبہ نہ پایا جائے کہ دھوکا اور فریب ہر حال میں ممنوع ہے تو سود اور جوئے کے ذریعہ بھی ایک حربی کا مال حاصل کیا جا سکتا ہے۔

لیکن اگر یہ معاملت دارالحرب میں ہوئی ہو اور طے پایا ہو کہ مال کا لین دین دارالاسلام میں ہوگا تو اس کی دو شکلیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر کسی نزاع کے بغیر باہمی رضامندی کے ساتھ لین دین ہو گیا تو مسلمان کے لیے اس مال کا لینا اسی طرح جائز ہے جس طرح وہ دارالحرب میں جائز تھا۔ دوسرے یہ کہ اگر باہم نزاع پیدا ہو جائے۔ اور معاملہ عدالت تک پہونچ جائے تو ایک مسلمان قاضی کے بس سے یہ بات باہر ہوگی کہ وہ ایک ایسے مال کے متعلق کوئی فیصلہ دے جو ایک فاسد معاملت کے ذریعہ کسی کے ذمہ عائد ہوتا ہو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی حربی جو کسی مسلمان تاجر کا شریک تجارت ہو اور اس نے بیمہ کا معاہدہ کسی دوسرے حربی کے ساتھ کیا ہو اور بیمے کی رقم صاحب معاملہ حربی سے وصول کر کے اپنے مسلمان شریک کے یہاں بھیجدی ہو تو اس مسلمان کے لئے اس کا بھی لینا حلال ہے کیونکہ وہ ایک حربی کا مال ہے جو اس کی رضامندی سے لیا گیا ہے۔ اور یہ معاملت دارالحرب میں ہوئی ہے اور اس پر قبضہ بھی دارالحرب میں ہوا ہے۔

اس بحث سے یہ معلوم ہوا کہ بیمہ کے متعلق شریعت کا یہ حکم کہ یہ معاملت فاسد ہے۔ اور تلف ہونے والے اور ہلاک ہونے والے مال کے بدلے کوئی معاوضہ لینا جائز نہیں ہے۔ اس اصل پر ہے کہ وہ کمپنی جس سے یہ معاوضہ لیا جاتا ہے۔

حقیقت میں اس نقصان اور اس کی ہلاکت میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔ اور معاملت کرنے والے کی جان و مال کے ساتھ نہ تو کوئی فریب کرتا ہے اور نہ کسی قسم کا دھوکا دیتا ہے ایسی صورت میں کمپنی کو معاوضہ کی ادائگی کا ذمہ دار ٹھرانا دراصل کسی کا ناحق مال کھانا ہے۔ جو یہ قطعی ممنوع ہے۔

اس سلسلہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیمہ کے معاملات جن کمپنیوں کے ساتھ کئے جاتے ہیں در اصل ان کی حیثیت مختلف حصص رکھنے والی کمپنیوں کی ہوتی ہے تو کیا یہ صحیح ہوگا کہ ان بیمہ کمپنیون کو کواپریٹو کمپنیوں کی حیثیت دیدیجائے جن مین اس کے حصہ دار اپنے رفقاد کے جانی و مالی نقصانات کی تلافی کے لیئے بطور اعانت علی الخیر ماہانہ یا سالانہ قسطوں کی شکل میں اپنی اپنی رقمین جمع کرتے رہتے ہیں۔ اور وہ رقم کسی منافع بخش کام میں لگادی جاتی ہے۔ تاکہ بوقت ضرورت وہ اس طرح کی ضروریات میں کام آسکے۔ اس طرح بیمے کی یہ کمپنیاں گویا امداد باہمی کی انجمنوں کے مشابہ ہوگی جن کا فنڈ ماہانہ چندوں کے ذریعہ اکٹھا ہوتا ہے۔ اور انجمن کے ممبران میں جو لوگ محتاج ہوتے ہیں یا کمانے سے معذور ہوجاتے ہیں یا بیمار رہتے ہیں۔ یا اس قسم کا کوئی اور معاملہ پیش آجاتا ہے جس میں وہ امداد کے محتاج ہوجاتے ہیں۔ تو ان کی مدد کی جاتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ انشورنش کمپنیوں کو امداد باہمی کی انجمنوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ امداد اس قیاس کے صحیح ہونے کے لیے اتنا کافی نہیں ہے کہ دونوں کمپنیوں میں شرکت کرنے والے ایک متعینہ رقم جمع کرتے ہیں اور تعاون علی الخیر کے مواقع پر اس جمع شدہ رقم میں سے خرچ کرتے ہیں۔ امداد باہمی کی انجمنیں دراصل اپنے چندہ

دہندگان سے اعزازی طور پر رقم حاصل کرتی ہیں۔ اور ان جمع شدہ رقوم میں سے مخصوص ضروریات میں وہ جو رقم خرچ کرتی ہیں وہ بھی ممبران انجمن کی طرف سے اعزازی ہوتی ہیں۔ یہ کوئی واجب الادا رقم نہیں ہوتی۔ اور نہ اس میں کوئی ایسی پابندی ہوتی ہے کہ اس رقم کا تقاضا کیا جاسکے یا اس پر کوئی نزاع قائم کیجاسکے اور اس کا فیصلہ کسی شرعی عدالت سے حاصل کیا جاسکے۔ بیمہ کمپنیاں کسی کے جان یا مال کا جو معاوضہ ادا کرتی ہیں۔ ان کی یہ حیثیت ہرگز نہیں ہوتی، بلکہ بیمہ کے معاہدہ کی بنا پر کمپنی قانوناً اس بات کی پابند ہوتی ہے کہ اس سے تقاضا بھی کیا جائے۔ اس پر مقدمہ بھی قائم کیا جائے۔ اور عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا کر خسارے کی ساری رقم اس سے وصول کرلی جائے۔ اور اس معاہدہ کے تقاضوں کا یہی وہ مکروہ پہلو ہے۔ جس کی شریعت اسلامی میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ تو دراصل کسی شخص پر ایک ایسی چیز کو لادنا ہے۔ جو اس پر کسی حال میں بھی شرعاً ضروری نہیں ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ بیمہ میں اس بنیاد پر کہ جو چیز شریعت کی رو سے لازم نہیں ہے اس کی پابندی کی جاتی ہے۔ اور کرائی جاتی ہے۔ نیز اس میں دوسروں کا مال ناحق کھانا روا رکھا جاتا ہے۔ اس لیے یہ ناجائز ہے تو پھر مرحوم شیخ محمد عبدہ کے اس مشہور فتوی سے اس خیال کی تطبیق کیونکر دیجا سکتی ہے۔ جس میں انھوں نے مذکورہ بالا وجوہ کو جانتے ہوئے زندگی کے بیمہ کی اجازت دیدی تھی۔ اور وہ بھی اس وقت جب کہ وہ دیار مصر کے مفتی تھے۔ لیکن اس وقت کے کسی عالم یا دینی امور کے کسی ذمہ دار شخص نے نہ تو اس پر کوئی گرفت کی اور نہ اس کا کوئی نوٹس لیا۔

اس اعتراض کا جواب دینے سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ سب سے پہلے وہ

سوال مع جواب کے درج کر دیا جائے جسے مستفتی نے دار الافتاء میں بھیجا تھا۔ اور
جس کا جواب شیخ محمد عبدہؒ نے دیا تھا۔ اس کے بعد ان کے جواب کی نوعیت پر غور
کیا جائے۔ سوالنامہ یہ تھا:

"موسیو ہور روسل نے پوچھا کہ ایک شخص کسی کمپنی سے اس شرط پر معاہدہ
کرنا چاہتا ہے کہ وہ ایک خاص مدت تک اپنے مال میں سے مقررہ قسطوں
میں ایک متعین رقم ادا کرے گا۔ اور جب اس معاہدہ کے مطابق مقررہ
وقت پورا ہو جائے گا۔ اور کمپنی نے بھی اس سرمایہ کو اپنے کسی تجارتی کاروبار
میں لگا کے فائدہ اٹھا لیا ہوگا تو وہ اپنا اصل مال منافع سمیت خود
لے لے گا یا اگر وہ فوت کر جائے گا تو اس کے ورثاء یا سرپرست اس کے حقدار
ہوں گے تو کیا یہ معاملہ جو اصحاب معاملت کے لیے نہایت سود مند ہے شرعاً
جائز ہے؟ براہ کرم اپنی مفید رائے سے ہمیں مستفید فرمائیں۔"

شیخ محمد عبدہؒ نے اس سوال کا درج ذیل جواب مرحمت فرمایا۔

"اگر اس طرح کا کوئی معاملہ جس طرح آپ نے لکھا ہے کسی آدمی اور کمپنی کے
درمیان ہو تو یہ معاملت شرعاً جائز ہے۔ اور اس آدمی کے لئے اقساط مقررہ کی
مدت ادائگی کے خاتمہ کے بعد اور سرمایہ کو کسی تجارت میں لگانے اور اس سے
نفع حاصل کرنے کے بعد جائز ہے کہ اگر وہ زندہ رہے تو مال اس کے منافع
کے ساتھ خود لے لے اور اگر فوت ہو گیا ہو تو اس کے جو ورثہ موجود ہوں یا
جنہیں اس کے مرنے کے بعد اس کے مال میں تصرف کا حق حاصل ہو وہ اصل
مع منافع کے لے لیں۔ واللہ اعلم"

شیخ محمد عبدہ کا یہی وہ فتویٰ ہے۔ جس سے انشورنس کے ایجنٹ فائدہ
اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اسلامی شریعت کے نقطۂ
نظر سے بیمہ کے فاسد ہونے اور انشورنس سے فائدہ اٹھانے کو "اکل اموال بالباطل"
نہیں سمجھتے ہیں۔ وہی لوگ زبردستی سے اس فتویٰ کی پناہ لیتے ہیں۔ حالانکہ مذکورہ
بالا سوال و جواب پر اگر غور کیا جائے تو نہایت آسانی کے ساتھ یہ سمجھا جاسکتا ہے
کہ یہ فتویٰ در اصل بیمہ کمپنی کے لائف انشورنس یا پراپرٹی انشورنس سے متعلق ہی
نہیں اور اس سوال و جواب میں انشورنس کے وہ بنیادی ارکان ہی نہیں
پائے جاتے جو اس معاملہ کے لئے ضروری ہیں۔ اور جن کی وجہ سے ان کے فاسد
ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے۔ بلکہ یہ سوال درحقیقت اس مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے
جس میں ایک طرف کسی کا سرمایہ ہو۔ اور دوسری طرف کسی تجارت یا صنعت
میں کسی کی محنت ہو۔ فقہاء کی اصطلاح میں اسے مضاربت کہتے ہیں۔ اور جس کا
دوسرا نام (قراض) ہے۔ یہ سوال انشورنس کے جوہری عناصر سے بحث ہی
نہیں کرتا مثلاً انشورنس کرانے والے کو اگر کوئی حادثہ پیش آگیا۔ اور اس نے
کئی برسوں میں ادا کی جانے والی مقررہ قسطوں میں سے صرف ایک ہی قسط
ادا کی ہو۔ جب بھی بیمہ کمپنی پورے انشورڈ مال کو خواہ وہ دسوں ہزار کا ہو
یا لاکھوں پونڈ کا ہو۔ ادا کرنے کی ذمہ دار ہوگی۔ اور یہی وہ شرط ہے جو در اصل
جوئے کی اصل و اساس ہے۔ اور اس لئے کہ اس معاملت میں التزام مالا یلزم
پایا جاتا ہے۔ اور مال ناحق کو مباح ٹھہرانا اور غلط طریقوں سے لوگوں کا
مال کھانا ہے۔

مسٹر یوروس کے مذکورۂ بالا سوال میں اس طرح کی کوئی شرط نہیں ہے جو اس معاملت کے فساد کی اصل بنیاد کی حیثیت رکھتی ہو اور نہ یہ سوال کسی ایسی منفعت سے تعرض کرتا ہے۔ اور نہ اس کے حصول کے طریقوں سے بحث کرتا ہے، جو صرف مال کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے اور مفتی کے لیے بھی اس کی گنجائش نہیں کہ وہ ایسے سوال کا جواب دے جو اس سے پوچھا ہی نہ گیا ہو۔ اور نہ مفتی کا کوئی جرم اور قصور رہے اگر اس کے فتویٰ کا غلط استعمال کیا جائے اور اس کو اس کے موقع و محل میں نہ رکھا جائے۔ البتہ اگر مفتی ایسی صورت میں خاموش رہے۔ یا اس کو معلوم ہو کہ مثلاً اس کا ایسا فتویٰ جو صراحۃً مضاربت و قراض جیسی معاملت کے جواز کے لیے ہے۔ وہ انشورنس کی ترویج و اشاعت کا ذریعہ بن جائے گا۔ پھر بھی وہ فتویٰ دیدے تو وہ یقیناً مجرم ہے۔ ایسی حالت میں مفتی کا فرض ہے کہ وہ اپنے فتویٰ کی جوابی تحریر میں ایسے الفاظ رکھے جن سے فساد کی راہ مسدود ہو سکے، اور وہ اس مسئلہ کے بارے میں بھی حکم شرعی بیان کرے جو اگرچہ اس سے پوچھا نہیں گیا ہے۔ لیکن اس کے سلسلے میں اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا جا سکتا ہو جیسے یہی انشورنس کا مسئلہ ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فقہ اسلامی میں ودیعت، اجارہ، کفالۃ وغیرہ جیسے بہت سے ابواب ایسے ہیں جن میں معاملات کی بعض صورتیں ایسی ہیں جو انشورنس سے ملتی جلتی ہیں۔ اور فقہا نے ان کے صحیح ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ مثلاً دو معاملت کرنے والوں میں سے کسی کا مال اگر دوسرے سے ضائع یا ہلاک ہو جائے تو وہ اس کا ذمہ دار ہوگا۔ اس کی روشنی میں بیمہ کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ایک

معاملت کرنے والے کے مال کے تلف یا ہلاک ہو جانے کی صورت میں بیمہ کمپنی در اصل معاہدہ کی بنا پر اس نقصان کا تاوان ادا کرتی ہے۔ جس کی حفاظت کا اس نے اس سے عہد کیا تھا۔ ایسی حالت میں اس کے ناجائز ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ — باب الودیعۃ میں فقہا نے لکھا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کے پاس کوئی امانت رکھے اور اس کی حفاظت کے بدلے اجرت بھی طے کر دے تو ایسی صورت میں اگر امانت ضائع ہو جائے تو امین اس امانت کا ذمہ دار ہوگا۔ پس مال کے بیمہ میں بھی یہی صورت ہونی چاہئے کیونکہ صاحب مال جو مال بیمہ کمپنی کے حوالہ کرتا ہے۔ وہ در اصل انشورڈ مال کے تحفظ کی اجرت ہوتی ہے۔ اور جب تھوڑا یا سارا مال ضائع ہو جاتا ہے تو بیمہ کمپنی تاوان میں اس کا معاوضہ ادا کرتی ہے

باب الاجارۃ میں بھی فقہا نے (اجیر مشترک) کے متعلق لکھا ہے کہ وہ مستاجر کے مال کے تحفظ کا ذمہ دار ہے۔ اگر اس سے تلف ہو جائے گا تو وہ اس کا ضامن ہوگا۔ اسی طرح باب الکفالۃ میں بھی فقہاء کا قول ہے کہ کسی کے پاس کوئی مال ہے اور وہ ایک شہر سے دوسرے شہر کو منتقل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن راہ میں چوروں اور ڈاکوؤں کا خطرہ ہے اور اسے یہ نہیں معلوم کہ کون سا راستہ محفوظ ہے اور کون سا غیر محفوظ۔ ایک آدمی اسے مشورہ دیتا ہے کہ فلاں راستے سے چلو یہ محفوظ راستہ ہے۔ اگر تمہارا مال ضائع ہوگا تو میں اس کا ضامن ہونگا' ایسی صورت میں اگر اسکا مال ضائع ہو جائے گا تو اس آدمی پر اس کی ضمان واجب ہوگی۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے مسائل کا سہارا مال کے بیمہ کے جواز میں لیا جاتا ہے

لیکن یہ استدلال محض سطحی قسم کا ہے۔ اس سے وہی لوگ استدلال کر سکتے ہیں جو
معاملات کے صرف ظاہری پہلو کو دیکھتے ہیں۔ حقیقت کو سمجھنے کی مطلق کوشش
نہیں کرتے۔ بیمہ کی اباحت کے لیے ان مسائل کو کسی درجے میں بھی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔
اگر ان مسائل کی اساس پر غور کیا جائے اور ان کے بارے میں علماء کے اقوال
کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ ان مسائل سے کس ڈھٹائی
کے ساتھ ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کیجاتی ہے۔

مثلاً امانت ہی والا مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ میں صاف تصریح ہے کہ حفاظت
کی اجرت کے ساتھ جو امانت کسی کو سونپی جائے۔ اس کے ضیاع کی ضمانت ہر حالت
میں امین پر واجب نہیں ہے۔ بلکہ وہ صرف ایسے حالات میں واجب ہوگی جن میں ضیاع
و تلف کے اسباب سے بچنے کا امکان ہوگا۔ اور اس نے اس سے بچنے کی کوشش نہ کی
ہوگی۔ لیکن جن حالات میں ان سے بچنے کا امکان نہ ہوگا۔ مثلاً موت اور
غرقابی وغیرہ۔ ایسی حالت میں امین پر اس کا ضمان نہ ہوگا۔ غور کیجئے امانت کے
اس مسئلہ کو بیمہ کے معاملہ پر کیونکر منطبق کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ بیمہ تو ہر حالت
میں مال کی ضمانت دیتا ہے۔ خواہ ضیاع و تلف کا کوئی سبب ہو یا نہ ہو۔ وہ حالات
و اسباب کے درمیان ممکن اور ناممکن میں کوئی فرق نہیں کرتا کہ ان اسباب
ہلاکت سے بچنا ممکن ہے اور ان اسباب سے بچنا ممکن نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ معلوم
ہے۔ انشورنس بیشتر ایسے ہی حالات و اسباب سے کرایا جاتا ہے۔ جن میں ضیاع
کے اسباب سے بچنا ممکن نہیں ہوتا۔

بیمہ کرائے ہوئے مال کی حیثیت بیمہ کمپنی کے نزدیک نہ تو امانت جیسی ہوتی ہے۔

اور نہ اس کی حفاظت میں بیمہ کمپنی کی حیثیت اجیر کی ہوتی ہے۔ پھر امانت کے مسئلے پر
انشورنس کے مسئلہ کو کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے۔ بیمہ کیا ہوا مال کمپنی کے قبضے میں
نہیں ہوتا اور نہ کمپنی کا اس سے کوئی تعلق ہوتا ہے۔ اور نہ وہ منڈیاں گودام اور
کارخانے جن میں بیمہ کرایا ہوا مال ہوتا ہے۔ بیمہ کمپنی کے ہوتے ہیں۔ اور نہ سمندر
میں لیجائے جانے والا سامان ان کمپنیوں کی کشتیوں اور جہازوں میں لدا ہوتا
ہے۔ غرض ان کمپنیوں کا اس مال سے کسی قسم کا کوئی بھی تعلق نہیں ہوتا۔ ایسی حالت
ان اموال کے ضیاع کی صورت میں ان کمپنیوں پر ضمان واجب کرنے کی کوئی
شرعی وجہ نہیں ہے۔ وجوب ضمان کی جو شرائط تھیں وہ یہاں یکسر مفقود ہیں۔
بالفرض اگر بیمہ کمپنیاں سمندر میں مال تجارت لیجانے والی کشتیوں کی مالک بھی
ہوں تو زیادہ سے زیادہ مال کے لیجانے اور اس کی حفاظت کے سلسلے میں ان کی
حیثیت اس اجیر مشترک کی طرح ہوگی۔ جس کا حکم فقہ اسلامی کی رو سے اوپر گذر
چکا ہے۔ یعنی جب ضیاع کا سبب ایسا ہو کہ اس سے بچنا ممکن نہ ہو تو ضیاع و تلف
کی حالت میں اس پر کوئی ضمان واجب نہ ہوگا اور بیمہ کے معاملات میں صورت
حال یہ نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں۔

اب ہم آخری مسئلہ پر جس کے بارے میں ہم نے کہا تھا۔ کہ انشورنس کو مباح
ٹھہرانے والے اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ گفتگو کرتے ہیں۔ وہ ہے کفالت یعنی راستہ
کے محفوظ ہونے کی ضمانت کا مسئلہ۔ اس بارے میں فقہا نے جو یہ حکم لگایا ہے کہ اگر
کسی نے صاحب مال کو ایک خاص راستہ پر چلنے کا مشورہ دیا اور اس راہ میں
اس کے مال کے ضائع ہوجانے کی صورت میں اس کے تاوان کی ذمہ داری بھی

ے لی تو اگر اس راستے میں اس کا مال ضائع ہوگیا تو ضمانت لینے والے پر کوئی ضمان
واجب نہیں ہوگا۔ البتہ جب صاحب مال راستہ کے خطرات سے بالکل ناواقف
ہو اور اس راستہ پر چلنے کا مشورہ دینے والے نے راہ کے خطرات اور اندیشوں
سے پوری واقفیت کے باوجود یہ مشورہ دیا کہ وہ ضائع شدہ مال کے تاوان کی
کا ذمہ دار ہوگا۔ کیونکہ اس نے صاحب مال کو فریب دیا اور اس کے ساتھ دغا
لیکن اگر رہنما راستے کے خطرات سے واقف نہ ہو بلکہ اس کو ہر طرح سے مامون
سمجھتا ہو تو پھر اس پر کوئی ضمان نہ ہوگا۔ ایسے ہی اگر رہنما بھی راستے کے خطرے سے
آگاہ ہو۔ اور صاحب مال بھی واقف ہو جب بھی رہنما پر کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی'
کیونکہ ایسی صورت میں صاحبِ مال نے خود اپنا مال ضائع کیا۔ رہنما کی رہنمائی
نے کوئی نئی بات نہیں پیدا کی جو ضمانت کی موجب ہو۔ یہ تمام تفصیلات فقہ کی متداول
کتابوں میں موجود ہیں۔

خلاصہ یہ کہ شریعت کے اصول و قواعد اور اس کے احکام کے استقصا سے
یہی ثابت ہوتا ہے کہ کسی شخص پر دوسرے شخص کے مال کی ضمانت نہیں ہے نہ بعینہٖ
وہ مال اور نہ اس کی قیمت اس وقت البتہ ضمان واجب ہوگا۔ جب کہ کوئی کسی
کے مال پر ناحق قبضہ کرلے یا اسے ضائع یا بالواسطہ اسے اس مال سے فائدہ
اٹھانے سے محروم کردے' ان میں سے کوئی بات بھی بیمہ کمپنیوں میں نہیں پائی جاتی
یہ کمپنیاں تو صاحب مال کے اس مال کی ضامن ہوگئی ہیں جو خود جل کر یا غرق
ہوکر یا چوروں کی چوری اور ڈاکوؤں کی لوٹ یا اسی قسم کے کسی اور حادثہ سے
ضائع ہوگیا ہو۔ خواہ ان سے بچنا کمپنی کے لئے ممکن ہو یا نہ ہو۔ مال کی ضمانت کی

یہ صورت ایسی ہے۔ جس کی اسلام کی عادلانہ شریعت میں کوئی گنجائش نہیں' یہ شریعت تو ایسی شریعت
ہے جو کسی حالت میں بھی ظلم اور غبن کو جائز نہیں سمجھتی اور نہ ناحق لوگوں کا مال
کھانے کو پسند کرتی ہے۔

بیمہ کمپنیوں کو دراصل بیمہ شدہ مال سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ بیمہ کی
ان قسطوں سے جنھیں معاملہ کرنے والے اصحاب مال سے حاصل کرتی ہیں' پہلے
ایک عظیم سرمایہ اکٹھا کرتی ہیں۔ اور پھر اسے قرضوں اور دوسری شکلوں میں
پھیلا کر اس سے نفع کماتی ہیں۔ پھر اسی کے بھاری منافع میں سے بیمہ شدہ مالوں
کے نقصانات کا قانونی معاوضہ ادا کرتی ہیں' حالانکہ اس نقصان میں ان کمپنیوں
کا کسی طرح سے بھی کوئی دخل نہیں ہوتا۔ نہ براہ راست اور نہ بالواسطہ اس لیے
ان کمپنیوں سے ایسے نقصانات کی تلافی اور ان کے معاوضہ کا مطالبہ کرنا
قطعاً غیر شرعی ہے۔ اسی طرح کمپنیوں کو بھی بیمہ کے شرائط کے مطابق مال والوں
سے مقررہ مالی قسطوں کے لینے کا شرعاً کوئی حق نہیں ہے۔ یہ سارے لوازم
و شرائط فاسد ہیں۔ اور جب معاہدہ فاسد شرط پہ مشتمل ہوگا تو وہ خود بھی فاسد ہوگا۔
بیمہ کمپنیاں دراصل روپیہ کمانے اور نفع حاصل کرنے کا نفع بخش کاروبار ہیں
ان کا راس المال (سرمایہ) عموماً وہی قسطیں ہوتی ہیں جنھیں انشورنس کمپنیاں اپنے
ممبران سے حاصل کرتی ہیں۔ پھر انھیں نفع بخش کاروبار میں لگا کر فائدہ حاصل کرتی
ہیں اور وہ منافع جنھیں اس مال سے حاصل کیا جاتا ہے قطعی طور پر اور ہر حال
میں اس گھاٹے سے زیادہ ہوتا ہے جو نقصانات کے معاوضہ کی ادائیگی کی صورت
میں یہ اپنے ممبروں کو ادا کرتی ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بیمہ کمپنیوں کے

سارے کام بہت ہی دقیق مطالعہ اور تفصیلی اعداد وشمار کی روشنی میں عمل میں لائے
جاتے ہیں جو بری، بحری وسائل نقل وحمل کی نگہداشت اور عام حالات میں معمول
کے مطابق نفع ونقصان کے تحفظ سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ مطالعہ اور اعداد وشمار ثابت
کرتے ہیں کہ اس کاروبار میں نقصان اور ضیاع کی مقدار بہت کم بلکہ شاذ ونادر ہی
ہوتی ہے عموماً مال محفوظ رہتا ہے۔ اور بیمہ کمپنیاں بغیر کسی تکلف کے کبھی کبھی اور اتفاقیہ
ہوجانے والے نقصانات کی تلافی اپنی وسیع کمائی سے کردیتی ہیں۔ اور باقی تمام سرمایہ
کمپنی کا ہوجاتا ہے جو سرتاسر نفع ہی نفع ہوتا ہے۔

مال کے بیمہ کے متعلق ان کمپنیوں کی یہ نہایت ہی واضح اور متعین پالیسی ہے۔
تھوڑے سے اختلاف اور شرائط وطرق کے تنوع کے ساتھ ایسی ہی صورتِ حال زندگی
کے بیمے کی بھی ہے۔

ان مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ بیمہ زندگی کا ہو یا مال کا، شریعت اسلامی کے
نزدیک معاملات کی کسی بھی صحیح شکل کے تحت نہیں آتا۔ زیادہ سے زیادہ اس کو
اس سلسلہ کی تیسری قسم میں داخل کیا جاسکتا ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کرچکے
ہیں یعنی زندگی یا مال کے لئے راہ کے امن وسلامتی کی ضمانت، ہم نے اس تیسری قسم
کی وضاحت میں بیان کیا ہے کہ

"اس طرح کی معاملت میں بھی شرعاً ضمان اسی وقت واجب ہوگا جب کہ
رہنمائے راہ کے تمام خطرات کو جانتے ہوئے فریب سے مشورہ دیا ہو اور صاحب
مال بھی جو اس غلط مشورہ کی بنا پر چل پڑا ہے۔ راہ کے خطرات سے بالکل
ناواقف ہو، اس کے وجوب کی وجہ صرف یہ ہے کہ رہنمانے اس مسافر کو کھلا ہوا

دھوکا دیا اور فریب سے کام لیا، لیکن انشورنس میں اس طرح کے دھوکے یا فریب کا
کوئی احتمال نہیں۔ اس لئے بیمہ کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

بیمہ کمپنیوں کی یہ وہ شکلیں ہیں۔ جن پر ان کا کاروبار چل رہا ہے۔ ان کمپنیوں نے خود
ساختہ قوانین کے تحت روپیہ پیدا کرنے کے ان تمام ذرائع کو مباح قرار دیا ہے جو انکے
بنائے ہوئے قوانین کے تحت آتے ہوں، اس کی صحت کی شرط صرف اس معاہدہ کے
دونوں فریقوں کا باہمی اتفاق ہے۔ گویا باہمی اتفاق ہی ان قوانین کی نظر میں فریقین
کی اصلی شریعت ہے۔ لیکن اسلامی شریعت کی اپنی مخصوص شکلیں اور خصوصی احکام
ہیں۔ اس نے لوگوں کے درمیان معاملات کی جملہ اقسام کو ایسی شرطوں کا پابند
کردیا ہے جن میں خلل انداز ہونے کی اجازت نہیں اور نہ ان کے خلاف اتفاق کرنے
سے وہ جائز ہوسکتی ہیں۔

جب دنیاوی قوانین دو آدمیوں کے درمیان ایسے اتفاق اور معاہدہ کو
جو عام نظام کے خلاف ہو تسلیم نہیں کرتے تو اسلامی شریعت کے احکام میں جو
سارے انسانوں کے درمیان تعامل کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ایسے اتفاق ومعاہدہ
کو کس طرح تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

خواجہ عزیز الدین عزیز کی شاعری

از جناب سید ضیاء الحسن صاحب استاد فارسی، مجیدیہ اسلامیہ کالج، الہ آباد

(۳)

خواجہ صاحب کے دماغ پر جنون کا اثر ہو گیا تھا۔ اس کے متعلق تذکرہ شمع انجمن میں ہے،

"در آغاز شباب بسودائے ابکار افکار، جنونے عسیر البرو بسرش پیچید پ بعد زمانے بشرف زیارت طب القلوب صلی اللہ علیہ وسلم در عالم رویا مرضش بصحت انجامید"[1]

مثنوی شروع کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

برخیز عزیز و راہ سر کن   گر مرد رہی قدم ز سر کن
بسم اللہ کن برہ گرائی   کین بس انگشت رہ نمائی

پھر صفت بسملہ اور صفت قرآن میں چند اشعار ہیں۔

ہر مرغ بیان کہ کرد پرباز   از بسملہ یافت بال پرواز
از بسملہ کردہ ام چو چوگان   اینک من و خصم و گوئی و میدان
ہست از ید قدرتش نمایان   انگشت اشارہ سوی قرآن

[1] تذکرہ شمع انجمن ص ۳۳۲

سی گنج بیگ خزانہ اندر   ہر گنج ہزار عقد گوہر
خوش رنگ بجلوہ ہر گل او   خوش زمزمہ ہفت بلبل او
کی مدنی بگفت گویش   ہندی عجمی بآرزویش

نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں ع

آن پردہ نشین حجلۂ راز   میخواست کہ پردہ را کند باز
شمعی پئی انجمن ہمی خواست   پروانۂ او شدن ہمی خواست
ہر جائے کہ او نماز می کرد   آن جائے بخویش ناز می کرد
از پرتو آن سہیل اعظم   شد رنگ پذیر ادیم آدم
آن روز او را خلیفہ کردند   کان گوہرے سپردند
ہم نار خلیل گلشن از وے   ہم چشم کلیم روشن از وے
رو شستہ بموی شانہ کردہ   در کتم ازل ختانہ کردہ
ایزد بخفا خطش بہ پرداخت   از ہفت ستارہ ہیکلش ساخت
عالم کہ بہ پارسائی افروخت   دفتر کدہ ہائے پارسی سوخت
جبریل امیں بدرس پرداخت   پنج آیہ اقرا ابجدش ساخت
در احمدؐ میم درمیاں نیست   این راز ہدیدہ در نہاں نیست
چوں دید محمدؐش شد از ہوش   بگرفت احد سرش در آغوش

الحق مشہود و شاہد است او
احمد۔ محمود و حامد است او

مثنوی میں کئی باتیں ایسی ہیں جن سے ذرا طوالت پیدا ہو گئی ہے۔

مثلاً طے امراحل در وادی دل" سگالشش بر احوال" خود" خطاب بہ نفس خود"، اظہار" عشق حقیقی" اور غاشیہ داری خامہ بر سبیل خطاب بآنجناب" وغیرہ۔

آخر میں خواجہ صاحب نے خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

دیدم کہ روان سبک چو آبم — بر سر شدہ چتر زن سحابم
ہم قافلۂ بہار گشتم — بر نکہتِ گل سوار گشتم

جاں ناقہ براہ دوست می راند — غوغائی نفس حدی ہمی خواند
رہ بود ہمہ زخار وخس پاک — وز ابر بہار خاک نم ناک

دیدم کہ بر آستانۂ خاص — استادہ یکے ز روی اخلاص
بحر عرفان ز آستینش — ملکِ وحدت تہہ نگینش

لب کرد سپید چوں مراد ید — دیدم کہ دمید صبح امید
پیش آمدم وسلام گفتم — گفتا زکجا، تمام گفتم

فرزند عراق ونے دمشقم — یعنی کہ غریب شہر عشقم
دستم بگرفت و کام جاں داد — نعلین بردرم نشاں داد

چون گشت درست جملہ کارم — دادند بہ بزم خاص بارم
بزمے کہ غبار آستانش — ریزند بعرش ساکنانش

بزمے کہ ز روشنی جا دید — فارغ ز فروغ ماہ وخورشید
یکسوی نشستہ بہ جمالاں — یک سوی ستادہ نونہالاں

خوش سیرت وخوش جمال وخوشروئے — خوش طینت وخوش خصال وخوشخوئے
گز گوشۂ چشم مہربانی — ممتاز شدم بہ میہمانی

سیراب زشہد وشیر گشتیم — خوردیم چنانکہ سیر گشتیم
تاحشر بخواب بودم ای کاش — کاین درد بگسِ نمی شدی فاش

زاں روز کہ آں جمال دیدم — یک لحظہ بخود نیا رمیدم
ہر شب ہمیں خیال خوابم — کاں دولتِ رفتہ باز یابم

وانگاہ کہ دل بدرد آید — از شدت شوق می سراید
اے یوسف حجلہ گاہ خوابم — بنگر کہ چہ با تب وتابم

اے دولت رفتہ زود باز آئے — باز از رہ مہر جلوہ فرمائے
چشم کہ مدام خوں بگرید — یکرہ بنگر کہ خون بگرید

یا بر سر جلوہ آئے پیشم — یا زود بخواں بسوی خویشم
بے روئ توگشتہ بزم دوراں — تاریک چو چشم پیر کنعاں

بے روئ توگشتہ بزم دوراں — تاریک چو چشم پیر کنعاں
دل بے توکہ بار بار نالد — بنگر کہ چہ زار زار نالد

روزے کہ عزیز با دل چاک — داغ تو برد بخویش درخاک
گویند ز رشک ہے فلاں مرد — آرائش عالم از میاں برد

یارب ز جہاں چو باربندم — چشم از خود وروزگار بندم
از داغ غمِ تو توشہ ام بس — وز خاک در توگوشہ ام بس

برنامِ تو بادہ اختتامم — لبریز ز بادۂ تو جامم

اس کے بعد مثنوی ہدیۃ الثقلین ختم ہو جاتی ہے۔

قیصر نامہ یہ مثنوی سکندر نامہ کے وزن پر اور اس کے جواب میں ہے۔ اس میں جنگ روم اور روس کا تذکرہ ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے خواجہ عزیز کی قابلیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"خواجہ صاحب کی علمی قابلیت کے ثبوت کے لیے قیصر نامہ جس کو جنگ روم و روس کا ایک مرقع کہنا چاہئے[1] پیش کیا جا سکتا ہے، نمونہ حمد ملاحظہ ہو۔

بنام خداوند کار آفرین — ہزار آفریں صد ہزار آفریں
ازل تا ابد بارگاہ ویست — گراں تا گراں در پناہ ویست
اگر از جلالش زند دم زباں — بلرزد سپہر بجنبد جہاں
رخ غازیاں را بخوں غازہ ساز — باآب دم تیغ جاں تازہ ساز
بگلش ابابیل چوں پر زند — صف زندہ پیلاں بہم بر زند

نمونہ نعت:-

بمعنے ز رحمت نخست آیتے — بظاہر ز دولت پسیں رایتے
زمیں تا فلک روشن از دین او — زآئینہ روشن تر آئین او
ز مہر نبوت کہ بر پشت زد — بمہر سلیماں زد انگشت رد
برید از آں روضہ شاداں شوم — اگر خار پاشم گلستاں شوم
بخاک درش کاش خاکم کنند — کز آلائش خاک پاکم کنند

مدح سلطان عبد الحمید:-

[1] دار العلوم ندوۃ العلماء کی روئداد سال دوم، اجلاس قیصر باغ لکھنؤ ۱۳۱۲ھ ۱۸۹۵ء ص ۱۰۱

باورنگِ شاہنشہی پائے اوست — دلی در دلِ عالمے جائے اوست
ہمیں پاسبانِ[1] کہین خانقاہ — کہین دیدبانِ مہین خوابگاہ
ز پشتش قوی پشتِ اسلامیان — بدورش بلند اخترِ شامیاں
درش مرجعِ ہفت ملت بود — دلے مرکز پنج نوبت بود

فوج پلونہ و عثمان پاشا:-

بر آشفت سلطاں ازیں دار و گیر — بفرمود بنوشت فرماں دبیر
کہ سالار عثمان جنگ آزمائے — ز ایوال بہ میداں شور گرائے
بر آراست اسپہبد صف شکن — قشونے بترکانِ شمشیر زن
ہمہ کاردان و قواعد شناس — چو ایمان خود جملہ محکم اساس
ہمہ نوجوانان ماہوت پوش — بخاکستری جامہ آتش فروش

عثمان پاشا:-

سپہدار عثمان جنگ آزمائے — خردمند دانا دل تیز رائے
محیطے و چوں کوہِ آتش بجوش — نہنگے بکف اژدہائے بدوش

جوانان ترک:-

ازیں سوئے ترکان طاعت گزار — بکار خداوند سر گرم کار
وضو کردہ ہر یک بخوناب خویش — بشوق سجودی سر افگندہ پیش
نمازی بخوں جا بجا ساختہ — دل از مہر و آزرم پرداختہ
شمردند محراب شمشیر را — رسانند بر عرش تکبیر را

[1] خادم الحرمین الشریفین۔

بہ پیکار کارے کہ تکبیر کرد — نہ شمشیر میکرد دنے تیر کرد
چناں سوئے شمشیر عریاں شدند — کہ گوئی ہم آغوش حوراں شدند

میدان کارزار میں عثمان پاشا کے گھوڑے کے . . . . اترنے کی منظر کشی

سمندش کہ میگشت در کوہ و دشت — ز لبس تیز رفت از جہاں درگذشت

عثمان پاشا کے جہاز سے اتر کر امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہونے کی منظر کشی

نخستیں بپا بوس سلطاں رسید — بلے قطرہ آخر بہ عماں رسید
سزد ہر را داغ بر دل نہاد — کہ سلطاں بہ پیشا نیش بوسہ داد
گو بوسہ تمنائے اخلاص بود — کہ تمنائے عثمانئی خاص بود

غرض مختلف اہم جنگی مناظر کا تذکرہ بڑے دلکش انداز میں کرتے کرتے مثنوی اختتام تک پہنچا دیتے ہیں۔ تلواریں نیام میں پہنچ جاتی ہیں۔ اور سلسلہ کشت و خون بند ہو جاتا ہے۔ سہ

چو شمشیر ہا رفت اندر نیام — کشیدم زباں من ہم آخر بکام

کسی زمانے میں اس جنگ کا تذکرہ زباں زد خاص و عام تھا، ہر مسلمان ترکوں کی کامیابی کی دعا میں مشغول تھا، اب تو شاید اس جنگ کے نام سے بھی نئی نسل آشنا نہ ہو گی،

مثنوی ارمغان لاجواب اس مثنوی کا دوسرا نام "گلگشت کشمیر جنت نظیر" ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس میں کشمیر کے خوبصورت و پرکشش مناظر اور اہم و مشہور مقامات کا ذکر ہے۔ مقالے کی طوالت کے خوف سے صرف منظر کشی کی

چند مثالیں پیش ہیں۔

پہاڑی علاقوں میں پر پیچ راہوں اور بل کھائی ہوئی پگڈنڈیوں کے قدرتی حسن سے لطف اندوز ہوئے۔ سہ

رہ پیچاں چو مالے حلقہ زن ہست — کہ از دارے معلق چوں رسن ہست
رہے پیچیدہ تر از خط ترسا — تو آن چو آن خامہ ز رفتن بیک پا
بریں رہ دیدہ ہر رہرو کہ بکشاد — تو پنداری کہ مو در چشمش افتاد
زبس باریکی ایں رہ بست پیدا — بزیر پا بود خط کف پا

کشمیر کے دار السلطنت سری نگر کی تعریف میں خواجہ صاحب یوں رطب اللسان ہیں۔

بہر بامے زند بلبل ترانہ — بپائے خود رود گل خانہ خانہ
بہر بزمے ز گل روشن چراغے — بود ہر خانۂ را خانہ باغے
بہر سو لالہ زار و سبزہ زار است — کہ داغستان و ملک سبزہ زار است
دو عالم یک گل رعنائے باغش — ارم گم کردہ خود را در سراغش

ڈل جھیل کشمیر کی مشہور ترین جھیل ہے۔ اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

خوشا آبے کہ مشہور آں بدل ہست — نہ دل تسنیم را نعم البدل ہست
بدریا ماہ اندر نقرہ کاری — بگلشن زر فشاں باد بہاری

غرض غزل ہو کہ قصیدہ، مثنوی ہو کہ مرثیہ، خواجہ صاحب نے ہر ہر صنف سخن میں طبع آزمائی فرمائی ہے اور اس کے ایسے نمونے چھوڑے ہیں جو فارسی ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

قصائد اصنافِ شاعری میں قصیدہ ایک اہم اور نازک صنف ہے۔ اس لئے کہ قصیدہ کا اصل موضوع مدح ہے۔ اور مدح اسی کی ہونی چاہیئے جو مدح کے قابل ہو۔ اور مدح میں جو کچھ کہا جائے سچ کہا جائے۔ جھوٹ اور مبالغہ سے پرہیز ہو۔ حضرت عمر فاروقؓ نے جو شعر و ادب کے بہترین نقاد تھے۔ مشہور شاعر زہیر کی مدح گوئی کی تعریف جن الفاظ میں فرمائی ہے، ان کا ترجمہ یہ ہے ''۔۔۔۔ وہ لوگوں کی صرف ان ہی خوبیوں کی تعریف کرتا تھا جو اُن میں واقعی پائی جاتی تھیں۔

قصیدہ کے الفاظ پرشکوہ اور تشبیب ممدوح کی شان کے مطابق ہونی چاہیئے، اس کے بعد قصیدہ کا وہ حصہ آتا ہے جو گریز کہلاتا ہے، یہ بہت نازک مرحلہ ہوتا ہے اس میں شاعر بڑے حسین انداز سے مدح کا رخ موڑ کر اصل مقصد کی طرف آتا ہے، جو شاعر جتنا زیادہ کہنہ مشق ہوگا اتنی ہی خوبصورتی سے اس نازک مرحلہ سے گذرے گا۔

قصیدہ کسی لالچ اور انعام کی خواہش میں نہیں کہنا چاہیئے۔ یہ اہم صنفِ سخن اسی تملق اور چاپلوسی کی وجہ سے بدنام ہوئی۔ مگر یہ شرطیں کم ہی شعرا پوری کرتے ہیں۔

خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی کے قصیدوں میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک باکمال شاعر کے معیاری قصائد میں ہونی چاہئیں۔

خواجہ صاحب نے امرا کی شان میں قصائد بھی لکھے ہیں۔ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نعتیں بھی اور ہر جگہ کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کے قصائد عموماً مختصر ہیں۔ اور ان کی ابتدا بڑے اچھے انداز کی ہے۔ مثلاً ایک نعتیہ قصیدہ انسان کی بڑائی اور عظمت کے بیان سے شروع ہوتا ہے۔ پھر عظیم انسانوں کے ذیل میں حضرت عیسیٰ علیہ والسّلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں کا تذکرہ کیا ہے۔ اور ان تمام پیغمبروں کو ستارے قرار دے کر

محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کو طلوعِ آفتاب سے تعبیر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

با این صفا کہ از زمیں انسان برآمدہ — گوئی زخاک چشمۂ حیواں برآمدہ
زاں چشمہ قطرہ قطرہ بود بحرِ بیکراں — زاں بحرِ بیکراں دُرّ و مرجاں برآمدہ
از خاک چشمہ کہ بود فیض آں محیط — در نار برق خرمنِ ایماں برآمدہ
آساں مگیر خلقتِ انساں کہ گوہرش — بسیار سعی رفت کہ ارکاں برآمدہ
گہ با جمالِ عیسیٰ مریم نمود روئے — گہ با جلالِ موسیٰ عمراں برآمدہ
گاہے ز گیر و دار گرو بے زپائے دار — بر طارمِ چہارم گیہاں برآمدہ
یونس ز بطنِ ماہی و یوسف ز قعرِ چاہ — نوح از بلائی ورطۂ طوفاں برآمدہ
شد مہر نیمروز خجل از فروغ جود — چوں ماہِ نیم ماہ ز گیلاں برآمدہ
گہ آبیار مرقعِ شرعِ شریف شد — گہ چشمہ سار بحرِ عرفاں برآمدہ
گہ فرخی فزائی جہاں شد چو مشتری — گہ پاسبانِ خلق چو کیواں برآمدہ
ہر کوکبے کہ جلوہ ہمی کرد شد نہاں — کز مکہ آفتابِ درخشاں برآمدہ
فر فروغ آں ہمہ عالم فرا گرفت — ہر ذرہ ہمچو آئینہ حیراں برآمدہ
ہر شش جہت ز پرتو آں رونقے گرفت — ہر ہفت ہفت گنبد گرداں برآمدہ
شد خاکِ مردہ زندہ و سرسبز کوہ و دشت — از ہر کنار سنبل و ریحاں برآمدہ
حسانِ ثابت از عرب آمد مدیح سنج — از ہند ہم عزیز ثنا خواں برآمدہ

تناسب الفاظ بھی قصائد کے لیے ضروری ہے اسی سے قصیدہ میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً

یکے ز چہرۂ او برقعہ ز آستینِ کلیم — یکے ز جلوۂ او خانۂ وادیٔ ایمن
یکے چو جامِ مل آمد عیاں ز طاقِ بلند — یکے چو بوئے گل آمد عیاں ز طرفِ چمن

یکے ز ظلمت او مرغ جام در فریاد — یکے ز فرقت او خلق شام در شیون

مضمون کو جاندار بنانے کے لئے پرشکوہ الفاظ کا استعمال بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔
خواجہ صاحب کے قصائد اس لحاظ سے بھی بڑے پرشکوہ ہیں۔

قطرہ تا دریای عماں از نوالش مستفیض — ذرہ تا خورشید تاباں از جمالش مقتبس

این شب وصل است یارب تا نیارد دم زدن — صبح را کن مبتلائے علت ضیق النفس

یکے بہ طلعت سقلابیان اطلس پوش — یکے بصورت اعرابیان عریان تن

اے زہے موسیٰ بنام وای خہی موسیٰ عصا — من عصی و من غوی گردید رزق اژدہا

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں خواجہ صاحب کا قصیدہ زبان و بیان کی فصاحت و بلاغت معانی کی گہرائی اور پختگی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس قصیدہ میں خواجہ صاحب سب سے پہلے دنیا کا ذکر کیا ہے اور اعلیٰ معیار کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ پرہیزگاری کی زندگی کے باوجود روز محشر کی باز پرس سے ڈرتے رہنا چاہئے۔

چیست دنیا مشت خاکے تیرہ پس کوری بود — از برائے مشت خاکے دل مکدر داشتن

بار دنیا ہر کسے برداشت گاوے بیش نیست — شیر مرد است آنکہ داند دل ازو بر داشتن

لیک باید خویش را با این ہمہ سعی و تلاش — خوفناک از باز پرس روز محشر داشتن

اس کے بعد دنیا کو ہیچ قرار دے کر اس سے قطع نظر کرنے اور اس سے خود شناسی کا سبق لینے کی تلقین کرتے ہیں۔

بگذار از بیہودہ گردی مگسل این سر رشتہ را — خویش را تا چند سرگرداں چو فرفر داشتن

شو جہاں افروز ہری نے کہ ہیچو آئینہ — میتوانی خانہ خود را منور داشتن

پھر کچھ اور اخلاقی تعلیمات دینے کے بعد حضرت علیؑ کی طرف گریز کرتے ہیں اور

ان کے نام کو اسم اعظم قرار دیتے ہیں۔

رہنمائی کردہ ام در پردۂ این رمز و بس — بایدت راہے بمقصد زیں در آید داشتن

حیدر صفدر کہ اسمش اسم اعظم ہست زاں — میتواں در کف کلید ہفت کشور داشتن

بندہ اش را بس بود بہر شکست لشکرے — در بغل شمشیر و بر لب نام حیدر داشتن

آں جہان پاک خواند از انکسارش بو تراب — خاک را می باید از افلاک برتر داشتن

نیست جز تائید پی در پی کہ چوں خیبر درے — کندن و برکندہ را برکندہ منبر داشتن

ہم خدا خرسند و باید بخت و طالع ہم بلند — از نبی دختر گرفتن زاں دو اختر داشتن

قصیدہ کا آخری حصہ بھی قابل دید ہے۔ خواجہ صاحب نے کس انداز سے اپنی تمنا کا اظہار کیا ہے۔ اور ممدوح پر جان نچھاور کرتے ہوئے ان سے رخصت ہوتے ہیں۔

بادشاہا سرورا تو خواجہ و من چاکرت — خواجہ را چشم کرم باید بہ چاکر داشتن

بندہ کم خدمت دل سادہ را خوش طالعیست — خواجہ مسکیں نواز و بندہ پرور داشتن

جاں کہ از دور فلک رنجور و محزوں آمدہ — در جوار روضۂ ات خواہم مجاور داشتن

می رسد گر بر سواد ایں ورق ناز و عزیز — آسماں بر خود چرا بالد ز اختر داشتن

نامۂ شوقے کہ دارد آں سوادے از خلوص — بایدش بہتر ز صد طومار و دفتر داشتن

گرنہ از وصف فلک خواہد بزر سنجیدنم — در ترازو از چہ ہست این خوردۂ زر داشتن

نے غلط گفتم فلک زینست سنگ ایں عیار — گوہری نتواں شدن از گنج گوہر داشتن

گر تو با خاک رہ خویشم بسنجی از کرم — پیشش من بہتر بود از گنج سنجر داشتن

خوش بہشت ہشت بہر مدح گستر روز حشر
جاں بزیر آں لوائے سایہ گستر داشتن

مکتوب سری لنکا

از پروفیسر ڈاکٹر اختر امام صدر شعبۂ اسلامیات و عربی، سری لنکا یونیورسٹی
۲۰۶، ترین کومالی اسٹریٹ، کینڈی، سری لنکا،

پیارے دیرینہ دوست سید صباح الدین صاحب سلام و محبت

کل صبح ایک طویل سفر کے بعد "وطن" لوٹا ہوں۔ خطوط کے ہجوم میں دیکھا کہ ہمارا دیرینہ دوست اور بیسیوں سنجیدہ کتابوں کا مصنف بھی مسکرا رہا ہے۔ دل میں کہا کہ دوستی کی شریعت میں گناہ کبیرہ کا مرتکب ہونگا اگر سب سے پہلے اس مخلص سے ہاتھ نہ ملاؤں اس لئے اولین فرصت میں نیم ملاقات کے بعد آپ کو یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔ سولہ دن شیوعیت کے ہر دوا میں گذارنے کے بعد واپسی میں کراچی اتر پڑا تھا تاکہ عزیز و اقارب سے مل سکوں، اردو میں باتیں کروں، مشاعروں میں شرکت کروں اور گلابی جاڑے میں شمامۃ العنبر یا موتیا سے دل و دماغ کو معطر کروں۔ کراچی کے بعد لاہور گیا جہاں منجملہ اور حضرات کے پروفیسر ارشد بھٹی سے بھی ملنا تھا۔ جنھوں نے اسلامی زاویۂ نظر سے کوئی آدھ درجن درسی کتابیں اردو میں لکھ ڈالی ہیں۔ ان کتابوں سے قطع نظر انھوں نے اسلامیات پر بھی اپنی سنجیدہ تصنیفیں پیش کی ہیں۔ لاہور میں کڑاکے کی سردی تھی تاہم اہل علم کی صحبتوں سے دل کو گرماتا رہا۔ وہاں سے اسلام آباد گیا۔ جہاں بچپن کے ہم سبق شمیم دیسنوی کو بھی ڈھونڈ نکالا۔ شمیم ڈھاکہ میں طبابت کرتے تھے۔

اور گرداب بلا سے صحیح و سلامت بچ کر نکل گئے تھے۔ جب چوتھائی صدی نہیں بلکہ نصف صدی کے بعد ان سے ملا تو سر کے بال بالکل سفید نظر آئے، ویسے تندرست ہیں مگر ضعیفی کے آثار، خد و خال سے نمایاں تھے۔ اسلام آباد سے کراچی پہنچا۔ اور ۱۰ دسمبر کو جب لنکا کے مطار میں قدم رکھا تو ساون بھادوں کی جھڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ ناریل کے خوشنما پتے ہواؤں میں جھوم رہے تھے، اور زعفرانی چادروں میں لپٹے لپٹائے ہوئے بھکشو آجا رہے تھے۔ ابھی مشکل سے گھر پر ایک ہی ہفتہ گذرا تھا کہ سرکاری حکمنامہ ملا کہ کمر بستہ ہو کر کل جو تجارتی وفد جزیرۃ العرب اور شمالی افریقہ جا رہا ہے اس میں شامل ہو جاؤں۔ دیار عرب اور مصر کے چپہ چپہ سے واقف پہلے بھی تھا مگر اس سفر میں ایک دلکش عنصر یہ بھی پیش نظر تھا کہ معمر قذافی کے لیبیا میں سانس لینے کا موقع ملیگا۔

کولمبو سے کراچی ہوتا ہوا کویت پہنچا۔ یہ ہمارے طویل سفر کی پہلی منزل تھی، سہ پہر کا وقت تھا ہم لوگ مطار سے تقریباً بارہ میل سفر کرنے کے بعد شہر میں داخل ہوئے۔ کویت کے متعلق ہمارا خیال یہ تھا کہ تیل کی بیشمار دولت سے ہوگا یہ بھی امیر شہر مگر عام مشرقی شہروں کی طرح جہاں چند سڑکیں تو خوشنما مکانوں اور دکانوں سے دلکش ہوا کرتی ہیں۔ مگر شہر کا بقیہ حصہ عموماً گندہ ہی ہوا کرتا ہے۔ اور خاک اڑتی رہتی ہے مگر کویت میں داخل ہونے کے بعد کچھ یوں محسوس کیا جیسے میں ہیمبرگ یا میونک کے کسی حصہ میں سانس لے رہا ہوں، وہی مغربی طرز کے فٹ پاتھ اور سڑک کے وسط میں دور تک درختوں کی قطاریں تاکہ آمد و رفت کے لیے علحدہ سڑک ہو۔ آراستہ مکانوں اور جگمگاتے ہوٹلوں کو دیکھتا چلا گیا، رات کے وقت سیر سپاٹے کے لیے نکلا اور قلب شہر سے ہٹ کر رہائشی علاقوں اور گلیوں کا رخ کیا۔ اور ہر دو قدم کے بعد مجھے مغربی یورپ کے شہروں کے مضافات ہی

نظر پڑے۔ دل میں کہا کہ دیارِ عرب اور یہ صفائی! علمی اعتبار سے بھی کویت عربی دانشکدوں کا سرتاج ہے۔ ایک دل خوش کن حقیقت یہ بھی ہے کہ روئے زمین پر کسی ملک میں انفرادی ماہانہ آمدنی کویت کے برابر نہیں ہے۔

کویت سے بغداد پہنچا جہاں پہلے بھی پاکستانی ملازمت کے زمانے میں رہ چکا تھا۔ سڑکوں کے کنارے کتب فروش کتابوں کو پھیلائے بیٹھے تھے۔ جہاں ادب اور مذہب کے علاوہ لینن اور کارل مارکس کے شیوعی تصورِ حیات پر بھی کتابیں موجود تھیں۔ اخباروں میں پہلے وزیروں کے ناموں کے ساتھ معالی الوزیر یعنی ہز ایکسلنسی لکھنے کی رسم تھی اب اس کی جگہ "رفیق" نے لی ہے۔ جو کامریڈ کا ترجمہ ہے۔ سرکاری عمارتوں پر جلی حروف میں ہر جگہ جو چیز جاذبِ توجہ تھی وہ یہ ہے کہ

أمة عربية أمة واحدة، ذات رسالة خالدة بعض گلیوں میں بھی

نحن أمة اشتراكية "بھی زینتِ دیوار تھا۔ سرکاری اعلیٰ عہدہ داروں سے بھی تبادلۂ خیال کا موقع ملا اور سبھوں کو یہی کہتے سنا کہ عربی اشتراکیت میں اقتصادی فلاح و بہبودی کا راز مضمر ہے نحن عرب قبل کل شئی سے بھی گوش آشنا ہوا۔ وفد کے کاموں اور ترجمانی سے فراغت ہوئی تو سیدنا حضرت محی الدین الجیلانی کے آستانے پر بھی سلام کے لیے حاضر ہوا۔ یہ بھی عجیب روحانی دربار ہے قلب کو فرحت نصیب کیسے نہ ہوتی؟ جمعہ کی نماز امام ابو حنیفہ کی مسجد میں ادا کی جو اب بھی امام اعظم کے نام سے پکارے جاتے ہیں اور پورا محلہ الاعظمیہ کہلاتا ہے۔ مسجد کے باہر جو قدیم گورستان ہے اس کا بیشتر حصہ کھود کر برابر کر دیا گیا ہے۔

۱۹۵۱ء میں ہمارا یہ دستور رہا کرتا تھا کہ امام الاعظم کی مسجد سے نکل کر اس تاریخی

گورستان کا رخ کیا کرتا تھا، تاکہ منصور حلاج کے ہمعصر مشہور صوفی حضرت ابوبکر شبلیؒ کو فاتحہ پیش کر سکوں۔ ایک قابلِ غور بات یہ بھی ہے کہ اہلِ بغداد کس کس قبر کو محفوظ رکھیں اس خاک میں تو سیکڑوں درخشندہ ستارے دبے ہوئے ہیں۔ امتدادِ زمانہ سے جہاں اور قبریں مٹ چکی ہیں ان میں امام احمد ابن حنبل کی ضریح مبارک کا نام و نشان بھی مٹ چکا ہے۔ وہی امام حنبل جنھوں نے متضاد سیرت کے حامل المامون کے ہاتھوں قید خانہ کی سختیاں برداشت کیں۔ اور مسند کی ضخیم جلدیں لکھ ڈالی تھیں اور بقول ابن خلکان جب جنازہ اٹھا تو لاکھوں مردوں کے علاوہ کم از کم ساٹھ ہزار عورتیں بھی جنازہ میں شریک تھیں۔ قبروں کا نشان باقی رہے یا نہ رہے، یہ بھی ان نفوسِ قدسیہ کی طرف سے اعلان ہوتا رہا ہے کہ

بعد از وفات تربتِ ما در زمیں مجو — در سینہ ہائے مردمِ عارف مزارِ ماست

بغداد سے قاہرہ گیا اور پھر وہاں سے اسوان تاکہ سدّ العالی بھی دیکھ لوں، پھر ہمارا وفد سرکاری عنایتوں سے لکسر (۵۰ × ۴۵۰ میل) گیا۔ فراعنۂ مصر کے عالیشان محلوں کے کھنڈرات دیکھ کر ان کی عظمت بیدار ہو جاتی ہے۔ ان محلوں کو مصری القصر کہتے چلے آئے ہیں، اور یہی الاقصر۔۔ اب فرنگی لہجہ سے لکسر کے نام سے مشہور ہے۔

عید کی نماز میں نے ماسکو میں پڑھی تھی، اور عید الاضحیٰ کی الاقصر میں۔ نیل کے کنارے اس روز رنگ برنگ ملبوسات کی بہار تھی۔ زنگار رنگ بادبان تیز ہواؤں میں آنچلوں کی طرح لہرا رہے تھے۔

مشہور یہودی کنز رپتی راک فلر نے بیش بہا رقم مصری اثری اکتشافات کے لیے دی تھی۔ جب آثارِ فراعنہ منظرِ عام پر آئے تو دنیا ان کی مردہ ثقافت کو دیکھ کر

انگشت بدنداں ہوگئی تھی، پھر مصریوں کو ماقبل اسلام تہذیب فراعنہ کا احساس ہوا اور
رفتہ رفتہ وہ اس کے گرویدہ ہوگئے۔ قاہرہ ریلوے اسٹیشن کے باہر مشہور فرعون رامیس
کا بت نصب کیا گیا، ڈاکخانہ کے ٹکٹوں اور نوٹوں پر فراعنہ کی صورتیں ظاہر ہوئیں اور
یہ فرعونیت اب بھی عروج پر ہے۔

ان انکشافات سے فرنگستان اور امریکہ کا جو مقصد تھا وہ پایہ تکمیل کو پہنچ گیا
یعنی یہ کہ مصری اسلامی تہذیب نہیں بلکہ فرعونی تہذیب کے گرویدہ ہوجائیں، آپنے
دیکھا کہ۔

کجا می نماید کجا می زند

مغربی مورخین اپنی تہذیبی میراث کا ذکر خیر یونان سے شروع کرتے ہیں، پھر
رومۃ الکبریٰ کے شاندار کارناموں کو سراہنے کے بعد صدیوں کو پھاندتے ہوئے یورپ کی
نشاۃ ثانیہ پر آکر دم لیتے ہیں جیسے غرناطہ اور قرطبہ قابل توجہ ہیں۔

جب میں طرابلس پہنچا تو فجر کا تارا جھلملا رہا تھا۔ ہوٹل پہنچتے پہنچتے اجالا ہونے لگا تھا۔
ہم لوگ اپنے اپنے کمروں میں جاکر بستروں پر دراز ہوگئے۔ رت جگے کے خمار کو دور کرنا ہی تھا
ناشتہ کے بعد جب باہر نکلا تو پہلی چیز جو نظر آئی وہ یہ کہ دکانوں کے تختوں پر کہیں بھی لاطینی
رسم الخط میں کوئی تحریر نہ تھی۔ بس عربی ہی عربی، طرابلس ایک دلکش اور آراستہ شہر ہے۔
مغربی طرز کا جنوبی فرانس یا بلجیم کے پایہ تخت برسلز سے ملتا جلتا۔ جب وزیر تخطیط یعنی
(Minister of Planning) سے ملاقات و تبادلہ خیال کے بعد بحیرہ روم
کے کنارے کنارے ہوتے ہوئے وزیر النفط یعنی وزیر روغن کے یہاں جارہے تھے، تو
چوراہوں پر موٹے حرفوں میں قرآنی ارشادات نظر آئے۔ انہیں آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

"ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ
ولی حمیم" (قرآن کریم)

آگے چل کر دوسری شاہراہ پر جس آیت کریمہ پر نظر پڑی وہ یہ تھی:
"وقل اعملوا فسیری اللہ عملکم ورسولہ والمؤمنون" (قرآن کریم)

جب سڑک سے کار مڑی تو دیوار پر نمایاں حرفوں میں یہ مطبوعہ کاغذ چپکا دیکھا:
"إن اشرف الکسب کسب الرجل من عمل یدہ" (حدیث شریف)

قلب شہر میں پھر معمر قذافی کی تقریر کا جو حصہ قابل توجہ تھا وہ یہ کہ:
"الثورۃ الثقافیۃ لاتنبع من فراغ انما تنطلق مسلحۃ بالنظریۃ
الثالثۃ وھی لیست من صنع الإنسان انما ھی عودۃ لتطبیق
الإسلام"

دوسری جگہ ایک سرکاری عمارت پر یہ آیہ شریفہ لکھی تھی:
"وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللہِ جَمِیعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا" (قرآن کریم)

ایک ریستوران کے اندر موٹے حرفوں میں لکھا تھا۔
"النظافۃ من الایمان"

یہی نہیں بلکہ تبلیغ کا دائرہ شاہراہوں سے ہوتا ہوا ایک دینار کے نوٹ تک
آگیا تھا۔ نوٹ پر لکھا ہوا تھا۔
"ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل" اور اس کے نیچے "صدق اللہ
العظیم"۔ یہاں نہ فرعون کی تصویریں تھیں اور نہ ماقبل اسلام کی روایات سے
تہذیبی سلسلہ جوڑا گیا تھا۔

جب میں قرآن وحدیث کے ارشادات عالیہ کو دیکھ رہا تھا۔ تو مشہور تاریخ "الفخری" کا مصنف ابن طقطقی یاد آیا جس نے بنوامیہ کے رجحانات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سلیمان مشہور خوش خوراک تھا، اسے لذیذ کھانوں کا بیحد شوق تھا اس کے عہد میں عوام جب دمشق کے باروں میں ملتے تھے تو ایک دوسرے سے پوچھا کرتے تھے رات تمنے کیا پکایا تھا۔ یزید بن معاویہ کے دور حکومت میں ناچ گانے کا زور تھا، اور شراب کھلم کھلا پی جاتی تھی کیونکہ بادشاہ شراب کا رسیا تھا، اور گوری گوری دوشیزاؤں کے جھرمٹ میں سانس لیتا تھا یہی مورخ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ لوگ بازاروں میں جب ملتے تو آپس میں پوچھتے تھے کہ رات تمنے تہجد کی نماز پڑھی یا نہیں؟ صباح الدین صاحب یہ ہے عکس "الناسُ علی دین ملوکھم"۔ کا طرابلس میں اسلامی شریعت کی فضا کیسے نہ ہو جب کہ جواں سال معمر قذافی شریعت کا پابند ہے۔

پہلے جہاں شراب خانے تھے، وہ اب مختلف قسم کے شربتوں سے آباد ہیں۔ آپ کو ہوٹلوں میں نارنگی، انار، انگور اور سیب کے رس ملیں گے، شراب کا کہیں نام ہی نہیں ہے۔ قمار خانے اور مراقص (ناچ گھر) ویران پڑے ہیں۔ ملک میں چوری کی وارداتیں گویا ناپید ہو چکی ہیں۔ طوائفوں کی جماعت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ دکانوں میں ایمانداری کا یہ عالم ہے کہ نہ چور بازاری ہے اور نہ دغابازی۔ اگر کوئی شراب پیتا ہوا پایا گیا یا کسی بیرونی ملک سے بوتل لے آیا تو شریعت کے مطابق سزائیں دیجاتی ہیں۔

ایک دن میں نے اپنے ہوٹل میں چند خوش پوشاک افریقیوں کو دیکھا جو مشک فام تھے میں نے سلام کے بعد ان سے پوچھا کہ آپ کس ملک سے آئے ہیں۔ میں نے سوال انگریزی میں

کیا تھا، اس نے فرانسیسی میں کہا کہ وہ مغربی افریقہ کی جمہوریہ گابون (Gabon) سے آیا ہے کیونکہ وہاں کے صدر جمہوریہ عمر گابون کل تشریف لائیں گے۔ یہ پہلے رومن کیتھولک تھے اور گذشتہ سال مشرف باسلام ہوئے۔ صدر گابون کی تشریف آوری کے بعد اسی ہوٹل میں صدر لیبیا معمر قذافی نے ایک دعوت کی جس میں ہمارا وفد بھی شریک ہوا اور میں اس جلیل القدر رہنما سے مل سکا۔ دعوت میں ڈنر کے موقع پر نارنگی اور سیب کا رس گلاسوں بھرا ہوا تھا۔ دوسرے دن شام کو طرابلس کے روزنامہ "الفجر الجدید" میں پڑھا کہ کل شام کو بارہ گابونی عمائدین جمہوریہ نے اپنی شریک حیات کیساتھ قذافی کے ہاتھ پر کلمہ شہادت پڑھا اور اسلامی برادری میں شریک ہوئے۔ وہ اخبار اس وقت ہمارے سامنے ہے اور سبھوں کے اسلامی نام افریقی ناموں کیساتھ درج ہیں۔

طرابلس کے ساتھ اسلامی تاریخ کے زریں ایام وابستہ ہیں۔ اسی طرابلس کی خاک سے فاطمہ بنت عبداللہ طلوع ہوئیں جن کی جرأت اور شہادت پر ابوالکلام نے ایک خون کو گرمانے والا مقالہ لکھ ڈالا اور اقبال کی وہ معرکۃ الآرا نظم فاطمہ بنت عبداللہ آپ کے سامنے ہے، اسی طرابلس کے جیالے استعمار فرنگ کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے، اور برتر عسکری قوت سے جام شہادت پیتے رہے جس کی صدائے بازگشت اقبال کی اس نظم میں ہے جس میں شاعر مشرق کہتے ہیں۔

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی — تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں — جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں

طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

ہاں ایک اور خصوصیت یہاں کی یہ ہے کہ نہ صاحب المعالی اور کامریڈ سے وزراء کو یاد کیا جاتا ہے اور نہ صاحب السعادۃ سے بلکہ محض "الأخ" یعنی بھائی سے۔ دیکھا آپ نے بغداد اور طرابلس کا فرق؟

واپسی میں شاہ فیصل سے ملنے کے لیے ہم لوگ جدہ گئے، جہاں شاہی محل میں باریابی ہوئی۔ میں وفد سے رخصت ہو کر مکہ مکرمہ گیا تاکہ عمرہ کی سعادت نصیب ہو۔

ہاں آپ نے ہمارے لندن کے قیام کے بارے میں پوچھا ہے، میں ایک سال سے اوپر یونیورسٹی کی اجازت سے برطانوی میوزیم میں عرب اور سیلون سے متعلق مواد جمع کرتا رہا۔

اب ان مصادر کے سہارے اپنی کتاب کو ترتیب دے رہا ہوں۔ ۷۱ء کے اکتوبر میں شاہ ایران کی دعوت پر ڈھائی ہزار سالہ جشن ملوکیت میں شرکت کے لیے گیا تھا، جہاں شیراز میں کنگرۂ ایران شناسان (World Congress of Iranologist) میں ایک مقالہ Ceylon-Iran Cultural Relations پر ایک مقالہ بھی پڑھا تھا جو اور علماء کے مقالوں کے ساتھ کتابی صورت میں تہران سے شائع ہوا ہے۔

ہماری اہلیہ ٹھیٹھ سیلونی ہیں۔ یہ لوگ Moor کہلاتے ہیں۔ میں نے انھیں اردو سکھا دی ہے۔ ان سے صرف اردو میں باتیں کرتا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ دوران سفر مین بہاریوں کی توجہ سے انھوں نے آلو کی بھجیا، ورقی روٹی، تری کھچڑی، اور پلاؤ پکانا سیکھ لیا ہے۔

شمالی ہندوستان سے یادیں وابستہ ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ اچانک اعظم گڑھ آدھمکوں اور آپ کی زیارت نصیب ہو۔

لنکا کے شہر کینڈی مین جو کولمبو سے بہتر میل وسط جزیرہ مین ہے، رہتا ہون، ۶۰ء سے جب کہ میں انڈونیشیا میں تھا، استعفا دے کر چلا آیا تھا اور ۱۹۶۴ء میں باضابطہ طور پر یہاں کا شہری بن گیا۔ اب سیلونی پاسپورٹ پر دیس بدیس مارا مارا پھرتا ہوں۔

یہ جزیرہ بیحد دلکش ہے، شادابیاں تو بس پھٹی پڑتی ہیں۔ خوشبودار مسالوں اور رنگارنگ وادیوں میں ہمارے لیل و نہار گذر رہے ہیں۔

جزیرہ میں اکثریت سنہالیوں کی ہے، جو بدھ مت کے پیرو ہیں۔ یہ لوگ گائے کا گوشت بھی کھاتے ہیں۔ اور شور کا بھی۔ ان میں مذہبی تعصب نہیں ہے مسلمانوں سے خوشگوار تعلقات ہیں۔

مورخ البلاذری نے فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ سیلون کو ہم لوگ جزیرۃ الیاقوت بھی کہتے ہیں کیونکہ یہاں کی دوشیزائیں بے حد خوبصورت ہیں۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

انما سمیت ھذہ الجزیرۃ جزیرۃ الیاقوت لحسن وجوہ نساءھا۔

ہمارے لنکائی صاحبزادے اب ماشاء اللہ وکیل ہو گئے ہیں۔

طرابلس سے جو کارڈ یہاں آیا تھا وہ اس وقت حاضر خدمت ہے۔

آپ کا دیرینہ دوست

اختر

مطبوعات جدیدہ

اہلحدیث اور سیاست، مرتبہ مولانا نذیر احمد رحمانی مرحوم متوسط تقطیع کاغذ کتابت وطباعت اچھی صفحات ۴۳۰ مجلد مع گردپوش قیمت للعہ پتہ: (۱) مکتبہ سلفیہ (مرکزی دارالعلوم) پوسٹ بکس ۱۹ بنارس، (۲) مکتبہ مرکزی جمعیۃ اہلحدیث ہند ۱۷۱۳۴ پریس اسٹریٹ دہلی

جمعیۃ اہلحدیث کے علماء واعیان کے تراجم اور ان کے علمی و تصنیفی خدمات کے متعلق مولوی ابویحیٰی امام خان نوشہروی مرحوم کی کتابیں عرصہ ہوا چھپ چکی ہیں، زیر نظر کتاب میں جمعیۃ کے معروف صاحب علم وقلم اور پرجوش کارکن مولانا نذیر احمد رحمانی مرحوم نے گذشتہ تحریک آزادی میں طبقۂ اہلحدیث کی سرگرمیاں دکھائی ہیں، اس کی ابتداء مولانا اسماعیل شہیدؒ کے مجاہدانہ کارناموں سے کی گئی ہے اس کے بعد حضرت سید احمد شہیدؒ کی جماعت مجاہدین کے اُن اصحاب کا ذکر ہے، جو ان کے زمانہ میں اور ان کی شہادت کے بعد ان کے مشن کو چلاتے اور سیاسی تحریکوں میں حصہ لیتے رہے ہیں اور جو مصنف کے خیال میں اہلحدیث تھے کتاب کے نصف آخر میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خیز واقعات اور اس دور کی سیاسی تحریکوں کا مختصر ذکر کرنے کے بعد میاں سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کا مفصل ذکر کیا گیا ہے، لیکن اس میں میاں صاحب کی تحریک آزادی سے وابستگی اور تعلق کا ذکر کم ہے، اور ان پر انگریزوں کی وفاداری کے الزام کی تردید میں زیادہ زور صرف کیا گیا ہے، یہ کتاب دراصل اس الزام کی تردید میں لکھی گئی ہے کہ "ہندوستان کی تحریک آزادی میں اہلحدیث کا کوئی حصہ نہیں ہے" اس لیے اس کا انداز علمی و تحقیقی کے بجائے مناظرانہ ہوگیا ہے، اور کہیں کہیں تحریر میں الجھاؤ

بھی ہے، شروع میں ہندوستان میں تحریک اہلحدیث کی ابتداء کا بھی مختصر ذکر آگیا ہے، گو شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کی اولاد احناف تقلید کے قائل نہ تھے، اور سید احمد شہیدؒ کی جماعت میں حنفی وغیر حنفی سبھی شامل تھے تاہم اہلحدیث کی باقاعدہ جماعتی تشکیل ان حضرات کے بعد ہی عمل میں آئی، یہ بھی بجا ہے کہ اہلحدیث کے متعدد علماء و زعما جن کا ذکر اس کتاب کے دوسرے حصہ میں آئیگا، آزادی کی جدوجہد اور سیاسی سرگرمیوں میں شامل رہے ہیں، لیکن جمعیۃ کا من حیث الجماعۃ سیاسی تحریکوں میں حصہ لینا مصنف کی اس کدوکاوش کے باوجود بھی پوری طرح ثابت نہیں ہوسکا ہے، اس سے قطع نظر یہ کتاب تلاش و محنت کا نتیجہ اور سید صاحب اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کی تحریک اور گذشتہ صدی کے بعض اہم واقعات کا مختصر خاکہ ہے۔

انیس نما۔ مرتبہ جناب عبدالقوی صاحب دسنوی تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت اچھی صفحات ۸۰ مجلد۔ قیمت ۔ ۔ غالباً اس پتہ سے ملے، شعبۂ اردو سیفیہ کالج بھوپال۔

جناب عبدالقوی دسنوی کو اشاریہ سازی کے کام سے خاص ذوق ہے، چنانچہ وہ مولانا سید سلیمان ندویؒ، اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کے مضامین اور مرزا غالب مرحوم پر لکھی گئی تحریروں کے اشارے اور انڈکس پہلے ترتیب دے چکے ہیں، اور اب انھوں نے اردو کے ممتاز اور صف اول کے شاعر میرانیس مرحوم کا اشاریہ ترتیب دیکر شائع کیا ہے، یہ مقالہ پہلے دلی کے سہ ماہی رسالہ تحریر میں چھپا تھا، اور اب مزید افادہ کے لیے اس کو کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ اس میں ان سب کتابوں کا ذکر کیا ہے، جو میر صاحب کے متعلق مستقلاً لکھی گئی ہیں، یا جن میں انکا تذکرہ ضمناً درج ہے، ان سب مضامین کی فہرست بھی اس میں آگئی ہے جو میر صاحب کے بارہ میں وقتاً فوقتاً مختلف اخبار و رسائل میں لکھے گئے ہیں، اشاریہ سازی کا کام خاصا دشوار ہے، مگر عبدالقوی صاحب نے اس کو محنت اور خوش اسلوبی سے انجام دیکر ایک مفید ادبی

خدمت کی ہے، اس سے انیس مرحوم پر کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملیگی۔

غزل، از۔ جناب کرشن موہن صاحب تقطیع متوسط کاغذ کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۱۶۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۰ پتہ نیشنل اکیڈمی ۲/۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۶

جدید اردو شاعری میں قدیم شعری روایات وقیود سے آزاد ہو کر جو نئے تجربے کئے جارہے ہیں، کرشن موہن صاحب اس کے مقبول ونمائندہ شاعر ہیں، ان کے کلام کے متعدد مجموعے طبع ہو چکے ہیں، زیر نظر مجموعہ ان کی غزلیات پر مشتمل ہے، اس میں جابجا انھوں نے اپنی "جدیدیت" کا بڑے فخر سے ذکر کیا ہے مثلاً ؎

یہ نیا رنگ، نئی سوچ، نئی لچک   روش عام سے بالکل ہے جدا فن اپنا

انھوں نے ہندی الفاظ کے کثرت استعمال سے اپنی غزلوں کو ایک نئی فضا اور نیا مزاج دینے کی کوشش کی ہے اور اس مجموعہ میں موضوع کی طرح قافیہ وردیف میں توسیع اور اوزان میں بھی کمی بیشی کے نمونے ہیں، گو اس طرح کی بعض جدتیں اور تجربے غزل کے لطیف و نازک مزاج پر بار ہیں تاہم کرشن صاحب نے بڑی حد تک اس کی رعنائی و شگفتگی کو قائم رکھا ہے، اور یہ مجموعہ موجودہ عہد کے حقائق وواقعات کا عکس اور گرد وپیش کے حالات کا آئینہ ہے، شروع میں محمود ہاشمی صاحب نے ان کے خصوصیات کلام تحریر کئے ہیں۔

امثال آصف الحکیم، از۔ الاستاذ الامام عبدالحمید الفراہی متوسط تقطیع کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۵۶ قیمت ۵۰ پیسے پتہ۔ دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڈھ

یہ عربی ریڈر مشہور حکیم آصف کی سبق آموز امثال وحکایات کا مجموعہ ہے، ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی نے اسکا انگریزی سے عربی میں ترجمہ کیا تھا، اسکے متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور یہ رسالہ عربی مدارس کے نصاب میں داخل ہے امید ہے کہ یہ نیا ایڈیشن بھی مقبول ہوگا، اور عربی کے مبتدی طلبہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ "ض"

جلد ۱۱۳ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۴ء نمبر ۶

مضامین

شذرات — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۴۰۲-۴۰۴

مقالات

کچھ قابل غور باتیں — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۴۰۵-۴۱۶

داخلی نقد حدیث — جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ — ۴۱۷-۴۴۰

فارسی کے چند نایاب ہندوستانی تذکرے، — جناب محمد توحید عالم صاحب ریسرچ فیلو شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی — ۴۴۱-۴۵۱

مولوی عبدالحق — پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب دہلی یونیورسٹی، دہلی، — ۴۵۲-۴۶۱

خواجہ عزیز الدین عزیز کی شاعری — جناب سید ضیاء الحسن صاحب لکچرار اردو وفارسی مجیدیہ کالج الہ آباد — ۴۶۲-۴۶۸

باب التقریظ والانتقاد

انڈو ایرانیکا کا سلور جوبلی نمبر — سید صباح الدین عبدالرحمن — ۴۶۹-۴۷۵

مطبوعات جدیدہ — "ض" — ۴۷۶-۴۸۰

خدمت کی ہے، اس سے انیس مرحوم پر کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملیگی۔

غزل، از۔ جناب کرشن موہن صاحب تقطیع متوسط کاغذ کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۱۶۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت صعہ پتہ نیشنل اکیڈمی ۹/۲ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۶

جدید اردو شاعری میں قدیم شعری روایات وقیود سے آزاد ہو کر جو نئے تجربے کئے جارہے ہیں، کرشن موہن صاحب اس کے مقبول و نمائندہ شاعر ہیں، ان کے کلام کے متعدد مجموعے طبع ہو چکے ہیں، زیر نظر مجموعہ ان کی غزلیات پر مشتمل ہے، اس میں جا بجا انھوں نے اپنی "جدیدیت" کا بڑے فخر سے ذکر کیا ہے مثلاً ؎

یہ نیا رنگ، نئی سوچ، نئی لچک روش عام سے بالکل ہے جدا فن اپنا

انھوں نے ہندی الفاظ کے کثرت استعمال سے اپنی غزلوں کو ایک نئی فضا اور نیا مزاج دینے کی کوشش کی ہے اور اس مجموعہ میں موضوع کی طرح قافیہ و ردیف میں توسیع اور اوزان میں بھی کمی بیشی کے نمونے ہیں، گو اس طرح کی بعض جدتیں اور تجربے غزل کے لطیف و نازک مزاج پر بار ہیں تاہم کرشن صاحب نے بڑی حد تک اس کی رعنائی و شگفتگی کو قائم رکھا ہے، اور یہ مجموعہ موجودہ عہد کے حقائق و واقعات کا عکس اور گرد و پیش کے حالات کا آئینہ ہے، شروع میں محمود ہاشمی صاحب نے ان کے خصوصیات کلام تحریر کئے ہیں۔

امثال آصف الحکیم، از۔ الاستاذ الامام عبدالحمید الفراہی متوسط تقطیع کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۵۶ قیمت۔ ع۵ روپیے پتہ۔ دائرہ حمیدیہ، مدرستہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ

یہ عربی ریڈر مشہور حکیم آصف کی سبق آموز امثال وحکایات کا مجموعہ ہے، ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی نے اسکا انگریزی سے عربی میں ترجمہ کیا تھا، اسکے متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور یہ رسالہ عربی مدارس کے نصاب میں داخل ہے، امید ہے کہ یہ نیا ایڈیشن بھی مقبول ہوگا، اور عربی کے مبتدی طلبہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ "ض"

جلد ۱۱۳ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۴ء نمبر ۶

مضامین

مضمون	مصنف	صفحات
شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۴۰۲-۴۰۴
مقالات		
کچھ قابل غور باتیں	شاہ معین الدین احمد ندوی	۴۰۵-۴۱۶
داخلی نقد حدیث	جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۴۱۷-۴۴۰
فارسی کے چند نایاب ہندوستانی تذکرے	جناب محمد توحید عالم صاحب ریسرچ فیلو شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی	۴۴۱-۴۵۱
مولوی عبدالحق	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب دہلی یونیورسٹی، دہلی	۴۵۲-۴۶۱
خواجہ عزیز الدین عزیز کی شاعری	جناب سید ضیاء الحسن صاحب لکچرار اردو و فارسی مجیدیہ کالج الہ آباد	۴۶۲-۴۶۸
باب التقریظ والانتقاد		
انڈو ایرانیکا کا سلور جوبلی نمبر	سید صباح الدین عبدالرحمن	۴۶۹-۴۷۵
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۴۷۶-۴۸۰

شذرات

آہ ڈاکٹر فریدی

جس حادثہ کا دھڑکا عرصہ سے لگا ہوا تھا وہ بالآخر پیش آکر رہا اور جس کے ہاتھوں سے اللہ تعالیٰ نے ہزاروں مایوس مریضوں کو شفا بخشی تھی اُس نے بھی گذشتہ ۱۹ ؍ مئی کو جان جاں آفرین کے سپرد کردی، مرحوم فریدی کے کن کن اوصاف کو یاد کیا جائے۔

اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

وہ ایک حاذق طبیب، بے غرض مخلص اور جری لیڈر اور سراپا انسانیت اور شرافت تھے، قومی و ملی مفاد کے مقابلہ میں کسی طاقت کو خاطر میں نہ لاتے تھے، اس کے لیے آخر وقت تک حکومت سے جنگ کرتے رہے، اور اپنی دولت صحت اور زندگی کسی چیز کی بھی پروا نہ کی، اور ایک بہادر سپاہی کی طرح اس راہ میں جان تک دیدی، انھوں نے قوم و ملت کیلئے جو قربانیاں کیں اس دور کے مسلمانوں میں مشکل سے اسکی مثال مل سکتی ہے، انکا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں سے خوف و ہراس اور احساس کمتری دور کرکے ان میں جرأت و ہمت پیدا کی، ان کا دامن فرقہ پروری سے بالکل پاک تھا، انھوں نے اقلیتوں اور پسماندہ طبقوں کے مفاد کیلئے مختلف سیکولر پارٹیوں سے مل کر اس کا عملی نمونہ پیش کیا، اگرچہ وہ مسلم مجلس کے بانی اور اس کے صدر تھے، لیکن کانگریسیوں سے بھی ان کے تعلقات تھے، اور وہ بھی ان کی عزت

کرتے تھے، انکی موت پر مختلف طبقوں کے اکابر اور جن کو ان کی سیاست سے اختلاف تھا، انھوں نے بھی جو تاثرات ظاہر کیے ہیں وہ ان کی مقبولیت کے شاہد ہیں

اس دور میں وہ تنہا شخص تھے جس نے سیاست سے کسی قسم کا ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اپنا کھویا، اگر وہ چاہتے تو حکومت کا بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کرسکتے تھے، لیکن اس کی طرف انھوں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، ان کے پیشہ کی آمدنی بڑے بڑے وزراء کی تنخواہ سے کئی گنا زیادہ تھی، اس کو انھوں نے بڑی فیاضی سے قوم و ملت کی راہ میں صرف کیا، اپنی سیاسی مشغولیتوں کی وجہ سے ہزاروں روپیہ کا نقصان اٹھایا، ان کی زندگی شاہانہ تھی، مگر قوم کی خاطر انھوں نے اپنے کو سادہ اور سخت زندگی کا عادی بنا لیا تھا، جس نے انکی صحت کو نقصان پہنچایا،

مریضوں کو ان کی حذاقت پر اتنا عقیدہ تھا کہ ان کے پاس پہنچکر ان کو اپنی صحت کا یقین ہو جاتا تھا، آدھا مرض تو وہ اپنی باتوں سے دور کردیتے تھے، وہ جس پایہ کے ڈاکٹر تھے اگر وہ چاہتے تو ان کی آمدنی دونی ہوسکتی تھی، لیکن صبح سے دوپہر تک وہ مریضوں کو مفت دیکھتے تھے، اور بہت سے غریبوں کو دوا بھی اپنے پاس سے مفت دیتے تھے، انکی شخصیت میں بڑی کشش تھی، ان کی سرو قامتی، ہنستا ہوا شگفتہ و شاداب چہرہ، ان کی جامہ زیبی، ان کا حسن اخلاق ہر چیز دامن دل کھینچتی تھی، وہ عملاً دیندار اور راسخ العقیدہ بلکہ خوش عقیدہ مرد مومن تھے، اس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آگیا، ایک مرتبہ وہ علی میاں سے ملنے کے لیے ندوہ آئے، اتفاق سے میں بھی موجود تھا، کسی سلسلہ میں داڑھی کا ذکر آگیا، ڈاکٹر صاحب کلین شیو تھے، میں نے اس کی سند جواز میں یہ واقعہ سنایا کہ مولانا حمید الدین فراہی ایک زمانہ میں داڑھی منڈوں سے مصافحہ نہ کرتے تھے، مگر جب حج سے واپس آئے تو

مصافحہ کرنے لگے، لوگوں نے پوچھا حضرت اس تبدیلی کا کیا سبب ہے، فرمایا حج میں ایسے داڑھی منڈے ترکوں سے ملاقات ہوئی جن کے جسم پر جہاد کے کئی کئی زخم تھے، جو ایمان کی سب سے بڑی کسوٹی ہے، اس وقت مجھے خیال آیا کہ ایمان داڑھی پر موقوف نہیں ہے، یہ واقعہ سنا کر میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ بھی ان ہی مجاہدین میں ہیں، اس پر انھوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور جھک کر سلام کیا۔

ان سے آخری ملاقات گذشتہ الکشن میں اعظم گڈھ کے دورے کے موقع پر اور اس سے چند مہینے بیشتر لکھنؤ میں ہوئی تھی، اس وقت ان کی صحت گر چکی تھی، دو چار قدم چلنے میں سانس پھولنے لگتی تھی، میں نے ان سے کہا ڈاکٹر صاحب اگر آپ کو قوم و ملت کی خدمت کرنا ہے تو اپنی صحت پر رحم کیجئے زیادہ دوڑ دھوپ نہ کیا کیجئے، جواب دیا اب میری زندگی کا کوئی اعتبار نہیں معلوم نہیں کب وقت آجائے، اس لیے چاہتا ہوں کہ جو مہلت بھی ہے اس میں جتنا کام بھی ہو سکے کر لیا جائے، آج انکا یہ جواب بے اختیار یاد آرہا ہے، اس میں کتنی بلندی اور بڑائی ہے،

دار المصنفین سے ان کا تعلق بڑا مخلصانہ تھا، وہ اسکے محسن اور اسکی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے، اسلیے انکی موت دار المصنفین کا ذاتی حادثہ اور قحط الرجال کے اس دور میں بہت بڑا قومی حادثہ ہے، جس کی تلافی مدتوں نہ ہو سکے گی، ان کے غم میں ہزاروں آنکھیں اشکبار اور ہزاروں زبانیں دعائے مغفرت میں مصروف ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو قبول فرمائے اور مرحوم کے نیک اعمال کے صلہ اور اپنے حبیب پاک کے طفیل میں ان کو دنیا کی طرح آخرت کی سرخروئی اور سربلندی بھی عطا فرمائے، اللھم اغفر لہ وارحمہ رحمۃ واسعۃ۔ ڈاکٹر صاحب اس دنیا سے اٹھ گئے، مگر ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مقالات

کچھ قابل غور باتیں

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

کائنات کی ساری مخلوق کے کچھ نہ کچھ خواص و لوازم ہوتے ہیں، جو ان سے کبھی جدا نہیں ہوتے، جب وہ چیز پائی جائے گی تو اس کے خواص و نتائج بھی پائے جائیں گے، مثلاً آفتاب کے طلوع سے روشنی اور غروب سے تاریکی پھیلے گی، بخارات ارضی کے صعود سے بارش اور بارش سے روئیدگی پیدا ہوگی، آگ جلائے گی، پانی ٹھنڈک پہنچائے گا، زہر ہلاک کرے گا، گندگی سے وبائیں پھیلیں گی، اسی طریقہ سے انسانی اعمال کے بھی خواص و لوازم اور اس کے نتائج ہوتے ہیں، نیک اعمال سے دل میں انشراح اور بد اعمالی سے انقباض پیدا ہوتا ہے، اعلیٰ سیرت و کردار، علم و فضل، اخلاص و صداقت خدمت خلق، بیکسوں کی دستگیری اور فیاضی و سیر چشمی وغیرہ اچھے اعمال سے خود اپنے قلب کو راحت ملتی ہے، اور سوسائٹی کی نگاہ میں عزت و وقعت پیدا ہوتی ہے، اور بدکردار نگاہوں سے گر جاتا ہے، چور کو سزا ملتی ہے، جھوٹے کا اعتبار نہیں ہوتا، بخیل ذلیل سمجھا جاتا ہے، یہی حال دوسرے اچھے برے اعمال کا ہے،

اس لیے انسان کو دنیا و آخرت دونوں میں جو جزا یا سزا ملتی ہے وہ درحقیقت

اس کے اعمال کا قدرتی نتیجہ ہوتی ہے، تجربہ و مشاہدہ بھی یہی کہتا ہے اور مذہب کی تعلیم بھی یہی ہے، قرآن مجید کا ارشاد ہے:

ان احسنتم احسنتم لانفسکم	اگر تم نیکی کروگے تو اپنی ذات کیلئے کروگے
وان اسأتم فلھا	اور برائی کروگے تو اس کے لیے کروگے
من عمل صالحا فلنفسہ، ومن	جس نے نیک کام کیا اس نے اپنے نفس
اساء فعلیھا وما ربک بظلام	کے لیے کیا اور جس نے برا کام کیا تو اس کا
للعبید	وبال اسی پر ہوگا، خدا بندوں پر ظلم نہیں کرتا،

یعنی خدا کی طرف سے کوئی ظلم و زیادتی نہیں ہوتی،

فمن اھتدی فلنفسہ ومن	جس نے ہدایت پائی تو اپنی ذات کے (فائدہ)
ضل فانما یضل علیھا	کے لیے اور جو گمراہ ہوا تو اسکے (نقصان) کیلئے
فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ	جو شخص ایک ذرہ کے برابر بھی نیک عمل کریگا تو وہ
ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ	قیامت میں اسکو دیکھے گا اور جو برا کام کریگا
	تو وہ بھی قیامت میں اسکے سامنے آئے گا۔
یوم تجد کل نفس ما عملت من	جس دن ہر شخص نے جو اچھے کام کیے ہیں انکو
خیر محضرا وما عملت من سوء	موجود پائے گا اور جو برے کام کیے ہیں
	ان کو بھی (موجود پائے گا۔

یعنی آخرت میں اعمال کی جو جزا و سزا ملے گی وہ انسان کے اعمال کا قدرتی نتیجہ ہوگی۔

انسان میں خیر و شر اور نیکی و بدی دونوں کی صلاحیتیں ہیں، حسن عمل میں وہ فرشتوں سے بھی بڑھ سکتا ہے اور بداعمالی میں شیطان کو بھی پیچھے چھوڑ جاتا ہے، اس کی اصلاح کی دو ہی

شکلیں ہیں، اخلاقی تعلیم و تربیت اور وحی الٰہی کی ہدایت و رہنمائی، تاریخ کا فیصلہ یہی ہے کہ ایک قادر مطلق ہستی پر ایمان و یقین اور اس کے خوف و خشیت کے بغیر محض اخلاقی تعلیم انسانی اصلاح کے لیے کافی نہیں ہے، دنیا میں بڑے بڑے اخلاقی مصلح پیدا ہوئے، فلسفۂ اخلاق پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئیں، لیکن ان کا کوئی دیرپا اثر نہ ہوا، ان کی کامیابی محض عارضی تھی، ان کی تعلیمات ان کے بعد فراموش کردی گئیں، اور انھوں نے اپنے بعد اپنی تعلیمات کا عملی نمونہ کوئی جماعت نہیں چھوڑی جس سے آنے والی نسلوں میں اصلاح کا سلسلہ قائم رہتا، اور آج انکا نام صرف کتابوں میں ملتا ہے، اور ان کا فلسفۂ اخلاق صرف کتب خانوں کی زینت ہے، اور دنیا میں اخلاق و روحانیت کی جو روشنی بھی نظر آتی ہے وہ وحی الٰہی اور انبیاء علیہم السلام کا فیض ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انسانی ہدایت و رہنمائی، اس کے تزکیہ و تطہیر، نیکی و بدی کی وضاحت، اس کی تعلیم و تربیت اور ترغیب و ترہیب کے لیے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا۔

یا ایھا النبی انا ارسلنٰک شاھدا	اے پیغمبر ہم نے تم کو شہادت دینے والا، خوشخبری
ومبشرا ونذیرا وداعیا الی	سنانے والا، خدا کی طرف اسکے حکم سے بلانے والا
اللہ باذنہ وسراجا منیرا	روشن چراغ بنا کر بھیجا۔
ھو الذی ینزل علی عبدہ	وہی اللہ ہے جو اپنے بندہ پر اپنی کھلی آیتیں
الکتاب آیت بینات لیخرجکم	اتارتا ہے، تاکہ تم کو تاریکیوں سے روشنی
من الظلمات الی النور	میں لائے۔
یتلوا علیھم آیتہ ویزکیھم	پیغمبر لوگوں کو خدا کی آیتیں سناتا،
ویعلمھم الکتاب والحکمۃ	ان کو پاک کرتا اور حکمت سکھاتا ہے۔

خدا نے ان کے ذریعہ نیکی اور بدی کی راہیں بھی بتادیں۔

وھدینٰہ النجدین

اور ہم نے انسان کو نیکی اور بدی دونوں کے راستے دکھا دیے،

ونفس وما سواھا فالھمھا فجورھا وتقواھا قد افلح من زکٰھا وقد خاب من دساھا

اور انسان اور اس ذات کی قسم جس نے اس کو درست بنایا پھر اسکو بدکاری اور پرہیزگاری دونوں چیزیں سمجھا دیں جس نے اس (نفس) کو پاک کیا اس نے یقینی فلاح پائی اور جس نے اسکو دبا دیا وہ ناکام و نامراد رہا۔

ان اچھے برے اعمال کی وضاحت، نیک کاموں کی ترغیب اور برے کاموں سے ترہیب اور ان کی جزا و سزا کی پوری تفصیل تمام الہامی صحیفوں میں ہے، اور علم صحیح اور ہدایت و رہنمائی کا سب سے قابل اعتماد ذریعہ یہی صحیفے اور انبیاء علیہم السلام ہیں لیکن موجودہ دور کے مادی نقطۂ نظر کا سب سے بڑا مغالطہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ انسانی عقل و شعور حد کمال کو پہنچ گئے ہیں اور اس نے حیرت انگیز کارنامے انجام دیے ہیں، سائنس کی ایجادات و انکشافات نے دنیا کو عالم طلسمات اور سامان تعیش کی فراوانی نے نمونۂ جنت بنا دیا ہے، انسانی اولوالعزمی اور عظمت کا جھنڈا سیاروں تک پر گڑ گیا ہے اور آیندہ اس سے بھی حیرت انگیز کارناموں کے امکانات ہیں، عقل کے سوا اس کو اور کسی طاقت کی رہنمائی کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔

انسان کے عقلی و ذہنی کمالات اور سائنس کے کارناموں کے متعلق جو کچھ بھی کہا جاتا ہے وہ سب تسلیم ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ اس نے کائنات کا معمہ حل کر لیا ہے، اس پر اس کے سارے اسرار منکشف ہو گئے ہیں، اور اب کوئی چیز پردۂ راز میں نہیں رہ گئی ہے، سائنس کی ساری ترقیوں کے باوجود پوری کائنات کا کیا ذکر کرۂ ارض کے متعلق بھی اس کا علم اور اس کی تحقیقات بہت

محدود اور ناقص ہے، اور خود علمائے سائنس کو اس کا اعتراف ہے کہ سائنس نے اب تک جو انکشافات کیے ہیں وہ غیر معلوم چیزوں کے مقابلہ میں سمندر کا ایک قطرہ ہیں،

پھر جس عقل و حواس پر انسان کو ناز ہے وہ صرف کرۂ ارض کے حالات کا ادراک کر سکتے ہیں، جو پوری کائنات کا حقیر ترین حصہ ہے، پوری کائنات میں اس سے کہیں بڑی جو بیشمار دنیائیں موجود ہیں ان کے احاطہ سے انسانی عقل قاصر ہے، اور ابھی بہت سی دنیاؤں کا علم بھی نہیں ہو سکا ہے، ان کے طبعی قوانین کرۂ ارض کے قوانین سے بالکل جدا ہیں، جو زمین سے چند میل کی بلندی پر بالکل بدل جاتے ہیں، اور ہمارے حواس وہاں کے لیے بالکل بیکار ہو جاتے ہیں، اور ہم ان کے بارہ میں ظن و تخمین کے علاوہ کوئی قطعی بات نہیں کہہ سکتے، جب اس مادی کائنات میں ہمارے حواس کے تعطل اور ہماری عقل کی نارسائی کا یہ حال ہے تو اس مادی کائنات کے ماوراء جو عالم ہے اس کے احوال و کوائف کا ادراک کس طرح کر سکتے ہیں،

اس عالم کے وجود سے انکار کی کوئی عقلی دلیل نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے علم و تجربہ میں نہیں ہے، لیکن کسی چیز کا علم نہ ہونا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں، خود اس دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ جب تک ان کا تجربہ و مشاہدہ نہیں ہوتا ہماری عقل ان کو قبول نہیں کرتی، لیکن تجربہ ہونے کے بعد حقیقت بنجاتی ہیں، ریڈیائی لہریں ہمیشہ سے موجود تھیں، لیکن اب سے چند سال پہلے کون اس کا یقین کر سکتا تھا کہ دنیا بھر کی آوازیں ہزاروں میل کی دوری سے آن واحد میں سنی جا سکتی ہیں، لیکن آج ایک عامی بھی اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور کانوں سے سن رہا ہے، اسی قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں، اس لیے اس مادی عالم کے ماوراء کسی عالم کے وجود سے انکار کی کوئی عقلی وجہ نہیں ہے، لیکن جس طرح اس عالم مادی کے حقائق کے ادراک اور اس کے اسرار کے انکشافات

کے لیے عقلی و ذہنی قوی اور علمی تلاش و تحقیق کی ضرورت ہے، اسی طرح ماورائے مادہ عالم کے ادراک اور اس کے احوال و کوائف کی معرفت کے لیے روحانی قوی کی ضرورت ہوتی ہے، جو انبیاء علیہم السلام اور خدا کے دوسرے برگزیدہ بندوں کو حاصل ہوتے ہیں، اور اس کا ذریعہ وحی الٰہی ہے، خاص قسم کی ریاضت سے غیر انبیاء کو بھی یہ قوت حاصل ہو جاتی ہے جس کو روحانی تلاش و تحقیق کہہ سکتے ہیں، لیکن سب سے معتبر ذریعہ وحی الٰہی ہے جس میں کسی غلطی کا احتمال نہیں انبیاء و اولیاء کے لیے عالم غیب عالم شہود بنجاتا ہے، اور وہ اس کو عالم مادی سے زیادہ حقیقی مانتے ہیں، اس عالم پر یقین مذہب کی جان ہے، اس لیے سارے الہامی مذاہب نے اس پر ایمان کا مطالبہ کیا ہے، اور انسانیت کی فلاح کا صحیح راستہ یہی ہے، اس کے بغیر دنیا میں بھی اس کو فلاح نہیں ہو سکتی

اس مادی نظام حیات اور اس کی زائیدہ تہذیب کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس نے انسانوں کو اس ایمان و یقین کی دولت اور ان کے حقیقی شرف و عظمت سے محروم کر کے محض گوشت پوست کی ایک مشین اور نفس پرست حیوان بنا دیا ہے، جس کی زندگی کی غرض و غایت تعیش و نفس پروری اور جاہ و اقتدار کا حصول ہے، اور اس کے وسائل دولت اور مادی ترقی اس کا مقصود و معبود بن گئے ہیں، ان کے سامنے انسانی شرف و عظمت کے اصلی ستون حق و صداقت، عدل و مساوات، انسانی ہمدردی، اور عفت و پاکیزگی وغیرہ اخلاقی اقدار کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہ گئی ہے، جس کے بغیر نہ صرف انسانیت کی تکمیل نہیں ہوتی بلکہ دنیا میں عدل و مساوات قائم نہیں ہو سکتا، اخلاقی قیود کے ٹوٹنے کے بعد پھر انسانی خود غرضی، اور بے راہ روی کی کوئی حد باقی نہیں رہتی، چنانچہ بغیر کسی اخلاقی قید کے نفس کے مطالبات کی تسکین اور زندگی کی لذتوں سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوزی

کا نتیجہ وہ اخلاقی انارکی اور فسق و فجور ہے جس کے سامنے حیوانیت بھی شرماتی ہے، اور حب جاہ و اقتدار کا نتیجہ ظلم و زیادتی اور فساد فی الارض ہے، جس کا مشاہدہ آج کی دنیا میں کیا جا سکتا ہے، بڑی طاقتیں دنیا کے بڑے سے بڑے حصے اور کمزور ملکوں اور قوموں کو اپنے حلقۂ اثر میں لانے کے لیے مختلف قسم کے ذرائع اختیار کرتی ہیں، اب سیاسی غلامی کا زمانہ ختم ہو چکا اس لیے مختلف خوبصورت ناموں، اور مالی، فوجی اور ٹکنیکل امداد کے ذریعہ چھوٹے اور کمزور ملکوں کو پھانستی ہیں، اس دام میں ایشیا کے پسماندہ اور ترقی پذیر ملک آسانی سے آجاتے ہیں جس سے مشکل ہی سے کوئی ملک مستثنیٰ نکل سکتا ہے،

اس نے خود ان قوموں میں مستقل رقابت اور کشمکش پیدا ہو گئی ہے، اور ان میں ہمیشہ گرم یا سرد جنگ جاری رہتی ہے، آپس کا اعتماد اٹھ گیا ہے، ایک قوت دوسری قوت سے خائف ہے اور اپنے تحفظ اور حریفوں کے مقابلہ کے لیے اس کی ساری ذہنی و دماغی قوتیں ایسے آلات و اسلحہ کی ایجاد میں صرف ہو رہی ہیں جس سے ان کو زیر کیا جا سکے، چنانچہ سائنس کی بیشتر اہم ایجادات جنگ اور اس کے متعلقات ہی کے لیے ہوتی ہیں، جن چیزوں کو انسانی عزم و حوصلہ کی فتح اور سائنس کے معجزے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، وہ بھی اسی جذبۂ مسابقت کا نتیجہ ہیں، جس نے دنیا کا امن و سکون خطرے میں ڈالدیا ہے،

اسی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ اس دور کی سیاست سراسر فریب و نفاق بن گئی ہے دل میں کچھ ہے زبان پر کچھ، لبوں پر تبسم اور زبان میں شیرینی ہے، اور دل میں بغض و عناد کی بھٹی سلگ رہی ہے، سیاست کی زبان بھی ذو معنی ہوتی ہے جس کے ظاہری معنی کچھ ہوتے ہیں اندرونی کچھ، اور معاہدوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہ گئی ہے، مختلف قوموں سے بیک وقت متضاد معاہدے کیے جاتے ہیں، اس دور کا سب سے بڑا اور کامیاب مدبر وہی ہے جو سب سے بڑا منافق ہو،

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا، ڈاکٹر اقبال جس زمانہ میں لندن میں پڑھتے تھے، انکی لینڈ لیڈی نے ان سے پوچھا، مسٹر اقبال کیا بات ہے کہ سارے پیغمبر ایشیا میں پیدا ہوئے، یورپ میں کوئی پیدا نہیں ہوا، انھوں نے جواب دیا یورپ میں شیطان پیدا ہوتے ہیں، اس نے کہا یہ کیسے، اقبال نے کہا، یورپ کے مدبرین شیطان ہی تو ہیں، یہ لطیفہ نہیں بلکہ حقیقت ہے، آج دنیا میں جو فساد بھی برپا ہے وہ سب انہی کا لایا ہوا ہے،

اس تہذیب کی بعض خوبیوں اور مادی فوائد سے انکار نہیں، اس کے متعلق جو بھی کہا جاتا ہے سب صحیح ہے، اس نے انسانی راحت اور اس کی تکلیفوں کے ازالہ کے ایسے ایسے سامان فراہم کر دیے ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، مغربی قوموں میں انسانی ہمدردی بھی ہے، جب کوئی ملک کسی ارضی وسماوی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ امداد کے لیے دوڑ پڑتی ہیں، انھوں نے انسانی بھلائی کے بہت سے کام کیے ہیں، مگر ان کے مادی تصور حیات نے ان کی ان خوبیوں پر پانی پھیر دیا ہے، یہی قومیں سیاست کے میدان میں چنگیز وہلاکو بن جاتی ہیں، وہ انسانی ہمدردی اور مادی ترقی کس کام کی جو انسان کو جوہر انسانیت سے خالی کر کے اسکو حیوان بنادے اور انسانی راحت وآسایش کے ساتھ اس کی ہلاکت وتباہی کے سامان بھی فراہم کر دے، اس کی مثال ایسی ہے کہ اعلیٰ درجہ کا عرق گلاب کھینچنے کے بعد اس میں نجاست بھی ملا دی جائے،

درحقیقت مذہب ہی میں وہ قوت ہے جو انسان کو اس کی حیوانی جبلت اور اخلاقی بے راہ روی سے روکتی ہے، اس سے ہماری مراد رسمی مذہب نہیں، بلکہ سچی خدا پرستی ہے، جو انسانوں میں ایسا اخلاقی احساس پیدا کر دیتی ہے جس سے وہ طبعاً نیکی اور بھلائی کی طرف راغب اور برائی سے نفور ہو جاتا ہے، یا کم سے کم برائی کو برائی سمجھتا اور اس کے

نتائج سے خائف رہتا ہے، برائی کو آرٹ اور ہنر نہیں سمجھتا، یہ صحیح ہے کہ مذہب کے ماننے والوں کی اکثریت بھی اس کی پوری پابند نہیں ہوتی، اور ہر قسم کی برائیوں میں مبتلا رہتی ہے، حقیقۃً ایسے لوگوں کا مذہب رسمی اور موروثی ہوتا ہے، حقیقی نہیں، اس کے باوجود جو لوگ خدا اور مذہب کو مانتے ہیں، ان کے دل اس کے خوف سے بالکل خالی نہیں ہوتے اور کسی نہ کسی وقت ان کو اپنی بداعمالی کا احساس ہوتا ہے، اور ان کی اصلاح کی امید رہتی ہے، لیکن جن کا عقیدہ یہ ہے کہ جو کچھ ہے بس یہی دنیا ہے، اس کے بعد کچھ نہیں، اور ان کا فلسفۂ حیات

ع بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

ہے انکی اصلاح کی کوئی امید نہیں، اس لیے موجودہ دنیا کو پہلے زمانہ سے زیادہ مذہب کی ضرورت ہے، جب انسان کی عقل وخرد خام اور اس کی زندگی سادہ تھی، اسکی برائیاں بھی سادہ اور محدود تھیں، تعیش ونفس پروری میں یہ تفنن اور آرٹ نہ پیدا ہوا ہوا تھا، اس کی وحشت اور درندگی کے نتائج بھی محدود تھے، جن سے زیادہ سے زیادہ چند ہزار جانوں کا اتلاف ہوتا تھا، یا ان کو نقصان پہنچتا تھا، لیکن موجودہ دور کے مہذب اور ترقی یافتہ انسانوں کے ہاتھوں ایک ایک جنگ میں لاکھوں انسان ہلاک اور کروروں بیکار ہوتے ہیں، ہلاکت خیز اسلحہ سے بڑے بڑے بارونق شہر چشم زدن میں خاک کا ڈھیر بنجاتے ہیں، ان سفاکیوں کو روکنے، قوموں وملکوں کے درمیان عدل وانصاف کے قیام اور ان کے اختلافات کے پرامن تصفیہ کیلئے بین الاقوامی مجالس قائم ہیں، لیکن وہ اپنے مقصد میں ناکام ہیں، اور طاقتور قوموں کا آلۂ کار بن گئی ہیں، ان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتیں اور آج بھی

جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا معاملہ ہے، بڑی طاقتیں ان کے فیصلوں کی کوئی پروا نہیں کرتیں اور یہ مجالس ایک تماشا بنکر رہ گئی ہیں، اس کا سبب بھی مادی تصور حیات ہے، جب تک یہ نہ بدلے گا کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی۔

جب کوئی قوم خدا فراموشی اور اخلاقی گراوٹ کی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو اس کی تباہی یقینی ہو جاتی ہے، ایسی قوموں کا عبرتناک انجام تاریخوں میں پڑھا جاسکتا ہے، بعض باجبروت قومیں ایسی مٹیں کہ آثار قدیمہ کی زبان کے علاوہ ان کی داستانِ عبرت سنانے والا کوئی نہیں، روما کا زوال تو تاریخی عہد کا واقعہ ہے، اس کے دورِ عروج میں کون اس کے زوال کا یقین کرسکتا تھا، مگر اس کے اخلاقی بگاڑ نے اس کو ایسا مٹایا کہ وہ دوسروں کے لیے سامانِ عبرت ہے، جو قومیں اپنی بداعمالیوں کے باوجود زندہ ہیں ان کے دو سبب ہیں، ایک یہ کہ ابھی زندگی کے بعض اصولوں پر ان کا عمل ہے، مثلاً قومی وحدت، محنت و جفاکشی، علم و تحقیق کی راہ میں جگرکاوی، ذاتی مفاد کے مقابلہ میں قومی مفاد کو ترجیح، ملک و قوم کی راہ میں ہر قسم کی جانی و مالی قربانی وغیرہ لیکن اخلاقی بگاڑ کے ساتھ یہ اوصاف بھی زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتے اور ان کے اعمال کا نتیجہ دیر سویر ظاہر ہوکر رہے گا۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ جس طرح قومیں صدیوں میں بنتی ہیں، اسی طرح ان کو بگڑنے اور مٹنے میں بھی ایک زمانہ لگ جاتا ہے، اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جو قومیں آج بامِ عروج پر ہیں وہ ہمیشہ رہیں گی، ان کے عروج کا ایک سبب ایشیا اور افریقہ کی دولت تھی وہ ان کے ہاتھوں سے چھن گئی ہے، برطانیہ جس کی حکومت میں کبھی سورج نہیں ڈوبتا تھا، انگلینڈ کے جزیرہ میں محدود ہوکر رہ گئی ہے، ہٹلر کا انجام نگاہوں کے سامنے ہے، جرمنی کا غرور

ٹوٹ چکا، سرمایہ داری اور کمیونزم دونوں میں گھن لگ چکا ہے، عجب نہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں تباہ ہوجائیں، مادی تہذیب کے ان نتائج کو دیکھ کر خود یورپ کے مفکرین اس کے انجام سے خائف ہیں، قوموں کو ان کے اعمال کی جو سزا ملتی ہے، کبھی وہ خرقِ عادت کی شکل میں ہوتی ہے اور کبھی قانونِ قدرت کے مطابق مثلاً سیلاب، زلزلے، ہوا کا طوفان، وبائیں، بدامنی، فتنہ و فساد، جنگ و خونریزی، قحط، معاش کی تنگی وغیرہ، اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو دنیا کے حالات عذاب الٰہی سے کم نہیں ہیں، سرکشی و بغاوت عام اور امن و سکون مفقود ہے، ہر قوم دوسری قوم سے خائف ہے، بڑی طاقتیں تک ایک دوسرے سے ہراساں اور اپنے تحفظ اور حریف کے مقابلہ کے لیے ہلاکت خیز اسلحہ کی دوڑ میں مشغول ہیں، حکومتوں میں آئے دن انقلاب ہوتے رہتے ہیں، کسی ملک کے سربراہ کی جان محفوظ نہیں، ایشیائی ملکوں کا حال اور بھی برا ہے، اس کی مثال خود ہمارا ملک ہے، ذاتی مفاد کے مقابلہ میں کم لوگوں کو ملک کے مفاد کی پروا ہے، قانون کا احترام ختم ہوگیا ہے، قانون شکنی عام ہے، بات بات پر اسٹرائکیں اور فساد ہوتے ہیں، گولیاں چلتی ہیں، جان و مال کا اتلاف ہوتا ہے، دیانتداری عنقا اور رشوت عام ہے، جس سے مشکل ہی سے کسی صاحبِ اختیار کا دامن پاک نکل سکتا ہے، دولت معبود و مقصود بن گئی ہے، ہر شخص اس کے پیچھے سرگرداں ہے، زندگی اتنی گراں ہوگئی ہے کہ وبالِ جان بن گئی ہے، یہ صحیح ہے کہ ملک نے صنعتی حیثیت سے بڑی ترقی کی ہے، قرض کی دولت بھی بڑھ گئی ہے ان طبقوں کا معیارِ زندگی بھی اونچا ہوگیا ہے، جن کے یہاں حلال و حرام کی قید نہیں، لیکن جائز آمدنی سے مشکل ہی سے کوئی آدمی معیارِ زندگی قائم رکھ سکتا ہے، ان ساری خرابیوں کا صرف ایک علاج ہے، اس کو مذہب کہہ لیجئے یا اخلاقی ذمہ داری کا احساس جو

بغیر مذہب کے پیدا نہیں ہو سکتا،

ہندوستان کے سارے لیڈروں میں اس پہلو پر صرف گاندھی جی کی نظر تھی، ان کے دماغ میں آزاد ہندوستان کا نقشہ موجودہ نقشہ سے بالکل مختلف تھا، انکی سیاست اور آزادی کی جدوجہد کی بنیاد حق وصداقت اور اخلاق وروحانیت پر تھی، سیاست جیسی ناپاک چیز میں بھی اخلاق کا دامن ان کے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹا، اس وصف میں وہ ساری دنیا میں منفرد تھے، انھوں نے ہمیشہ خدمت کو عہدوں پر ترجیح دی، اور ہندوستان کی آزادی کے بعد وہ کانگریس کو ایک خدمت گذار جماعت دیکھنا چاہتے تھے، لیکن عہدوں اور دولت کے مقابلہ میں کون ان کی سنتا، وہ عمر بھر عملاً سادگی کا سبق دیتے رہے، ان کے نزدیک کارخانوں کے قیام کے مقابلہ میں دیہاتوں کی اصلاح مقدم تھی، انھوں نے نیچے طبقوں کو اٹھانے کی کوشش کی، اور اپنے عمل سے سادگی اور مساوات کا سبق دیتے رہے، لیکن آج کی کانگریس اور حکومت کو ان کی تعلیمات اور ان کے عمل سے کوئی نسبت نہیں ہے، ہندوستان میں جو بحران بپا ہے، وہ سب ان کی تعلیمات کو فراموش کرنے کا نتیجہ ہے، اور اس کی فلاح انکی تعلیمات پر عمل ہی پر موقوف ہے۔

داخلی نقدِ حدیث

از

جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی، ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

(۲)

حدیث کے دو جزو ہیں۔

(۱) متن اور۔ (۲) سند۔

"متن" اصل حدیث کو کہتے ہیں اور "سند" اس تک پہونچنے کے ذریعہ اور راستہ کو کہتے ہیں "سند" اگرچہ اصل حدیث کا جز نہیں ہے لیکن چونکہ اولاً حدیث کی صحت کا مدار سند ہی پر ہے، اس بناء پر محدثین کے نزدیک اس کی حیثیت کسی طرح جزء سے کم نہیں ہے۔

متن پر گفتگو کا تعلق داخلی نقد حدیث سے ہے،

"سند" پر گفتگو، کا تعلق خارجی نقد حدیث اور "متن" پر گفتگو کا تعلق داخلی نقد حدیث سے ہے۔ ابن دقیق العید کہتے ہیں۔

كثيراً ما يحكمون بذلك — بسا اوقات حدیث کے وضعی (جعلی)

ای بالوضع باعتبار امور — ہونے کا حکم ان امور کی وجہ سے لگاتے

ترجع الی المروی والالفاظ — ہیں جنکا تعلق مروی (متن حدیث)

الحدیث [1]

اور الفاظ حدیث سے ہے۔

ابن صلاح کہتے ہیں،

وقد یفہمون الوضع من قرینة حال الراوی او المروی فقد وضعت احادیث طویلة یشہد بوضعہا رکاکة الفاظہا ومعانیہا [2]

کبھی حدیث کی وضعیت (جعلی ہونا) راوی یا مروی (متن) کی حالت سے سمجھی جاتی ہے، چنانچہ بہت سی طویل حدیثوں کے الفاظ و معانی کی رکاکت (سطحیت) خود وضعی ہونے کی شہادت ہے۔

ابو الحسن علی بن محمد کتانی کہتے ہیں۔

قرینة فی المروی لمخالفته لمقتضی العقل بحیث لا یقبل التاویل ویلتحق بہ ما یدفعہ الحس والمشاہدة والعادة [3]

مروی (متن) میں وضعی ہونے کا قرینہ یہ ہے کہ وہ مقتضائے عقل کے خلاف اسطرح ہو کہ کوئی تاویل نہ قبول کر سکے اسی میں وہ بھی شامل ہے جو حس، مشاہدہ اور عادت کے خلاف ہو۔

مقدمہ المغنی میں ہے۔

لم یقف العلماء عند نقد الحدیث

علماء نے نقد حدیث کے معاملہ میں

---

[1] شمس الدین محمد سخاوی۔ فتح المغیث بشرح الفیة الحدیث، الموضوع۔ [2] عثمان بن عبد الرحمن ابن صلاح علوم الحدیث (مقدمہ ابن صلاح) النوع الحادی والعشرون معرفة الموضوع۔ [3] ابو الحسن علی بن محمد کتانی تنزیہ الشریعة المرفوعة عن الاخبار الشنیعة الموضوعة فصل فی حقیقة الموضوع وامارتہ وحکمہ۔

من حیث سندہ لا بل تعدوا الی النظر فی متنہ فقضوا علی کثیر من الاحادیث بالوضع وان کان سندہا سالما اذ وجدوا فی متونہا عللا تقضی بعدم قبولہا [1]

صرف سند پر اکتفا نہیں کیا بلکہ متن کی طرف ہی توجہ کی چنانچہ بہت سی ایسی حدیثوں کے وضعی ہونے کا فیصلہ کیا جن کی سندیں اگرچہ درست تھیں لیکن ان کے متن میں خرابیاں پائی جاتی تھیں جن کی بنا پر وہ قابل قبول نہ تھیں۔

ذیل میں داخلی نقد حدیث کی بنیاد قرآن حکیم، سنت نبویؐ اور صحابہؓ کے فرمودات سے ذکر کی جاتی ہے۔

قرآن حکیم میں داخلی نقد کی بنیاد

قرآن حکیم میں داخلی نقد کی بنیاد یہ آیتیں ہیں۔

فقد لبثت فیکم عمرا من قبلہ [2]

عمر کا بڑا حصہ میں تمہارے اندر گذار چکا ہوں۔

آیت میں صحت کی ضمانت زندگی کے اس حصہ کے لئے پیش کی گئی ہے جو قبل نبوت ہے تو بعد نبوتؐ کی زندگی اور اس کے فرمودات میں کیونکر ایسا نقص پایا جائے گا۔ جس سے علم و عقل کی خلاف ورزی لازم آئے۔

واذا جاءہم امر من الامن او الخوف اذاعوا بہ ولو ردوہ الی الرسول

جب ان کے پاس امن یا ڈر کی خبر آتی ہے تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں اگر اس کو رسولؐ اور اولو الامر تک

---

[1] ابو حفص عمر بن بدر الموصلی الحنفی۔ المغنی عن الحفظ والکتاب مقدمہ ص ۱۰۔ [2] یونس رکوع ۲

والی اولی الامر منهم لعلمه	پہونچا دیتے ہیں تو جو اُن میں ملکہ
الذین یستنبطونه منهم [1]	استنباط رکھنے والے تھے وہ اس کو
	پوری طرح معلوم کر لیتے۔

"الامر" میں ہر بات وشرعی واقعہ شامل ہے۔

لان الامن والخوف حاصل	کیونکہ امن اور خوف ہر اس چیز میں
فی کل ما یتعلق بباب	موجود ہے، جس کا تعلق باب
التکلیف [2]	تکلیف سے ہے۔

"اولو الامر" سے مراد اہل علم وصاحب فقہ ہیں اھل العلم والفقہ [3] جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل علم وصاحب فقہ حدیث کی داخلی نقد وتحقیق اور اس کی صحیح حیثیت متعین کرنے پر مامور ہیں پھر یستنبطونہ کے اضافہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نقد وتحقیق کے زیادہ مستحق وہ اہل علم وصاحب فقہ ہیں جو "ملکہ استنباط" رکھتے ہیں۔

قرآن حکیم کی کئی آیتوں میں رسول اللہ کے کاموں کی تفصیل بیان کی گئی ہے جن میں اہم کام "تعلیم حکمت" ہے۔ اگر آپ کی طرف منسوب الفاظ کے معانی اور مفہوم میں کوئی نقص پایا گیا تو حکمت کی خلاف ورزی ہوگی، جو شان نبوتؐ کے منافی ہے۔

سنت نبوی میں داخلی نقد کی بنیاد

سنت نبوی میں داخلی نقد کی بنیاد یہ حدیثیں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا۔

اذا سمعتم الحدیث تعرفه	جب کوئی ایسی حدیث تم سنو جس سے
قلوبکم وتلین له	تمہارے دل کو انسیت ہو اور

[1] النساء رکوع ۱۱ [2] رازی۔ تفسیر کبیر ج ۳ نساء [3] قرطبی۔ نساء رکوع ۱۱۔

اشعارکم وابشارکم و	تمہارے بال وکھال اس سے متاثر ہوں
ترون انه منکم قریب	اور اپنے سے اس کو قریب سمجھو تو میں
فانا اولاکم به واذا	اس کا تم سے زیادہ حقدار ہوں اور
سمعتم الحدیث عنی	جب کوئی ایسی حدیث تم سنو جس سے
تنکره قلوبکم وتنفر منه	تمہارے دل اسکو قبول نہ کریں اور
اشعارکم وابشارکم	تمہارے بال وکھال اس سے متوحش
وترون انه منکم بعیداً	ہوں اور اپنے سے اس کو دور سمجھو تو
فانا ابعدکم منه [1]	میں تمہاری نسبت اس سے زیادہ دور ہوں۔

دوسری جگہ فرمایا۔

ما حدثتم عنی ما تنکرونه	تم سے ایسی حدیث بیان کی جائے
فلا تاخذوا به فانی	جس سے تمہارا دل اس کو ناپسند کرے
لا اقول المنکر ولست	تو اسکو مت قبول کرو کیونکہ میں نہ
من اهله [2]	منکر کہتا ہوں اور نہ اسکا اہل ہوں

ظاہر ہے کہ مذکورہ روایتوں میں حدیث کی شناخت سے متعلق رسول اللہؐ نے جو کچھ فرمایا اس کا تعلق متن حدیث یا داخلی نقد حدیث سے ہے جس کے لیے خاص مناسبت اور فنی ذوق کی ضرورت ہے۔

اوپر کہا گیا ہے کہ حدیث (سنت نبویؐ) کا سرچشمہ شعور نبوت ہے جس کے لیے نہایت

[1] مسند احمد حدیث ابی اسید الساعدی [2] ابو الحسن علی بن محمد کتانی۔ تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ۔ عن الاخبار الشنیعۃ الموضوعۃ فصل فی حقیقۃ الموضوع

اعلیٰ درجہ کا فہم و تدبر ضروری ہے۔ اسی بنا پر متعدد روایتوں میں فقہ و تفقہ (فہم و تدبر) سے کام لینے کا خاص طور سے ذکر ہے۔ اس لیے اگر رسول اللہؐ کی طرف منسوب الفاظ، معانی اور مفہوم میں کوئی نقص پایا جائے تو اس سے شعور نبوت مجروح ہوگا اور نبوتؐ کی ضمانت ختم ہو جائے گی۔

صحابہ کے فرمودات میں داخلی نقد کی بنیاد

صحابہؓ کے فرمودات میں داخلی نقد کی بنیاد حسب ذیل روایتیں ہیں

(۱) حضرت ابوہریرہؓ نے حضرت عبداللہؓ بن عباس سے جب یہ حدیث بیان کی کہ

الوضوء مما مست النار ولو من ثور اقط[1]	جس چیز کو آگ چھوئے اس کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اگرچہ پنیر کا ایک ٹکڑا ہی ہو

تو ابن عباسؓ نے فرمایا۔

انتوضأ من الدهن انتوضأ من الحميم[2]	کیا ہم چکناہٹ اور گرم پانی کے استعمال سے بھی وضو کریں۔

وضو رت مرد کی کرنا ہے۔ یہ محل متعین کرنے کی ضرورت اسی بنا پر پیش آئی کہ حدیث کا ظاہری پہلو درایت[3] کے خلاف تھا۔

حضرت عائشہؓ کے سامنے جب یہ حدیث بیان کی گئی کہ نوحہ کرنے سے مردہ پر عذاب ہوتا ہے، تو انھوں نے فرمایا۔

حسبکم القرآن ولا تزر و	قرآن کافی ہے جس میں مذکور ہے

۱؎ و ۲؎ ابن سعد ترمذی حدیث الوضوء مما غیرت النار

وازرۃ وزر اخریٰ[1]	کہ کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائیگا۔

اس حدیث میں عذاب کو اس صورت پر محمول کیا گیا ہے۔ جس میں مردہ پر نوحہ کرنے کا سبب بنے (یعنی رونے کی وصیت کر جائے یا کسی کو مقرر کر جائے) اس کے بغیر قرآن سے ربط نہیں قائم ہو سکتا۔

محمود بن ربیع صحابی نے ایک مرتبہ یہ حدیث بیان کی۔

فان اللہ قد حرم علی النار من قال لا الٰہ الا اللہ یبتغی بذٰلک وجہ اللہ[2]	جس شخص نے خالص اللہ کی رضا کے لیے لا الٰہ الا اللہ کہا اللہ نے اس پر آگ حرام کر دی۔

حضرت ابو ایوبؓ انصاری نے سنکر فرمایا۔

واللہ ما اظن رسول اللہ قال ما قلت قط[3]	خدا کی قسم میرا خیال ہے کہ جو تم نے کہا رسول اللہؐ نے کبھی نہ فرمایا ہوگا۔

اس حدیث کے ظاہری الفاظ سے چونکہ عمل کی اہمیت گھٹتی ہے جو درایت کے خلاف ہے اس بناء پر ابتدائی مرحلہ میں حضرت ابو ایوبؓ انصاری کو اس کے قبول کرنے میں تامل ہوا لیکن حدیث کا محل متعین ہونے کے بعد تامل کی گنجائش نہیں رہتی وہ یہ کہ لا الٰہ الا اللہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے تقاضہ پر عمل بھی کیا ہو جو خالص رضاء الٰہی کے لیے کہنے کا لازمی نتیجہ ہے۔

محدثین نے داخلی نقد حدیث سے دریغ نہیں کیا

قرآن و سنت اور صحابہؓ کے فرمودات میں چونکہ یہ بنیادیں موجود تھیں اس بناء پر محدثین نے حدیث کی تحقیق میں داخلی نقد سے کام لینے میں دریغ نہیں کیا جیسا کہ درج ذیل تصریحات سے ثابت ہوتا ہے۔

۱؎ مشکوٰۃ باب البکاء علی المیت ۲؎ و ۳؎ بخاری ج ۱ باب صلوٰۃ النوافل جماعۃ

عمرو بن میمون کہتے ہیں۔

رائیت فی الجاهلیة قردًا	میں نے زمانہ جاہلیت میں بندر کو دیکھا جس نے
اجتمع علیها قردة قد زنت	زنا کیا تھا اس پر بندروں نے جمع
فرجموها فرجمتها معهم [1]	ہوکر اس کو سنگسار کیا چنانچہ میں نے
	بھی ان کے ساتھ سنگسار کیا۔

حافظ ابن عبد البر (مشہور محدث) نے اس واقعہ پر نکیر کرتے ہوئے کہا ہے۔

فیها اضافة الزناء الی غیر	اس میں غیر مکلف کی طرف زنا کی
مکلف واقامة الحد علی البهائم	نسبت ہے اور جانوروں پر حد
وهذا منکر عند اهل العلم [2]	(سزا) قائم کرتا ہے، جو اہل علم کے نزدیک ناقابل قبول ہے

ایک روایت میں ہے۔

خلق الله آدم وطوله ستون ذراعا [3]	اللہ نے حضرت آدم کو پیدا کیا تو انکا
	قد ساٹھ ذراع تھا۔

حافظ ابن حجر نے اس کی شرح میں لکھا ہے۔

ویشکل علی هذا ما یوجد	اس میں یہ اشکال ہے کہ قدیم قوموں
الآن من آثار الامم	کے جو آثار پائے جاتے ہیں مثلاً
السالفة کدیار ثمود	قوم ثمود کی بستیوں میں ان کے
فان مساکنهم تدل علی	مسکنوں سے ثابت ہوتا ہے کہ

۱؎ بخاری ج ۲ کتاب بنیان الکعبہ باب القسامة فی الجاهلیة ۲؎ ابن حجر فتح الباری ج ۷ باب القسامة فی الجاهلیة ۳؎ بخاری ج ۲ کتاب الانبیاء باب خلق آدم وذریته

ان قامتهم لم تکن مفرطة	ان کے قد حد سے زیادہ بڑے نہ تھے
الطول علی حسب ما یقتضیه	جیسا کہ ترتیب سے ظاہر ہوتا ہے۔
الترتیب السابق [1]	

ایک روایت میں ہے۔

من عشق فعف فمات فهو	جس شخص نے عشق کیا اور پاک دامن
شهید [2]	رہا وہ مرگیا تو شہید ہوا۔

دوسری جگہ ہے۔

من عشق وکتم اعف وصبر غفر	جس شخص نے عشق کیا اس کو چھپایا
الله له وادخله الجنة [3]	اور پاک دامن رہا اور صبر کیا تو اللہ
	اس کی مغفرت کریگا اور جنت میں داخل کریگا

حافظ ابن قیم اسکو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

فلو کان اسناد هذا الحدیث	اگر اس حدیث کی سند آفتاب کی طرح
کالشمس کان غلطا ووهما [4]	بھی ہوتی تو بھی یہ غلط اور وہم ہوگی۔

محدثین کی زیادہ توجہ جمع حدیث وخارجی نقد حدیث پر تھی

اس میں شک نہیں کہ محدثین حدیث کی تحقیق میں سند کے علاوہ ان کے معانی اور مفہوم پر بھی نقد کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے جمع حدیث اور خارجی نقد وتحقیق میں جس قدر شاندار کارنامے انجام دیئے داخلی نقد وتحقیق میں اسکا ثبوت نہیں ملتا۔ چنانچہ "گولڈ سیہر" جیسے مستشرق نے بھی ان کے کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے۔

۱؎ ابن حجر فتح الباری۔ بدء الخلق۔ ۲؎ ۳؎ ۴؎ ابن قیم زاد المعاد ج ۲ ذکر حدیث من عشق الخ

حدیثوں کو جمع کرنے کے لیے محدثین نے اسلامی دنیا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے اندلس سے وسط ایشیا تک، شہر شہر اور گاؤں گاؤں کا پیدل سفر کیا تاکہ دوسروں تک منتقل کرسکیں اس زمانہ میں۔ حدیث جمع کرنے کی اس سے زیادہ معتبر اور قابل اعتماد صورت نہ تھی، رحّال (بہت سفر کرنے والے) اور جوّال (بہت سیر و سیاحت کرنے والے) کے قابل فخر القاب دراصل ان اونچے درجہ کے لوگوں سے کبھی جدا نہیں ہوے۔ راہ علم کے مسافروں کے لیے طواف الاقالیم (ملکوں کا طواف کرنے والے)، نہ کسی استعارہ پر مبنی ہے۔ اور نہ اس میں کسی طرح کا مبالغہ ہے۔ ان لوگوں نے تمام ملکوں کا سفر محض سیر و سیاحت یا تجربہ حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا۔ بلکہ ان کا مقصد صرف حدیث کے جاننے والوں سے ملنا اور ان سے حدیثیں حاصل کرنا تھا۔ حدیث کی طلب و جستجو میں ان کی مثال اس چڑیا کی تھی جو ہر درخت (اس کی ہر شاخ) پر اسکی پتیوں سے غذا حاصل کرنے اور لطف اندوز ہونے کے لیے بیٹھتی ہے۔[۴]

ڈاکٹر اسپرنگر نے الاصابہ کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

"اگر مسلمانوں کے سوانحی ریکارڈ جمع کیے جائیں تو ہمیں پانچ لاکھ ممتاز شخصیتوں کے حالات میسر آجائیں گے اور یہ معلوم ہو گا کہ ان کی تاریخ میں کوئی "دہا" یا کوئی اہم مقام ایسا نہیں ہے کہ جس میں ان کی نمائندگی مفقود ہو۔

فقہاء کی زیادہ توجہ داخلی نقد حدیث پر تھی

اسی طرح فقہا نے داخلی نقد و تحقیق پر جس قدر شاندار کارنامہ انجام دیا ہے خارجی نقد و تحقیق میں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ طاہر بن صالح الجزائری، کہتے ہیں[۵]

[۵] طاہر بن صالح بن احمد الجزائری۔ توجیہ النظر الی اصول الاثر۔ مطلب فی امور ینبغی الانتباہ الخ

ان المحدثین قلما یحکمون علی الحدیث بالاضطراب اذا کان الاختلاف فیہ واقعا فی نفس المتن لان ذالک لیس من شانہم من جہۃ کونہم محدثین وانما ہو من شان المجتہدین۔

حدیث پر محدثین اس صورت میں اضطراب کا حکم بہت کم لگاتے ہیں جب کہ نفس متن میں اختلاف ہو کیونکہ بحیثیت محدث یہ ان کا کام نہیں ہے۔ بلکہ یہ مجتہدین کا کام ہے۔

حضرت اعمش رض کا قول اس سلسلہ میں زیادہ واضح ہے۔ انھوں نے فقہاء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

انتم الاطباء ونحن الصیادلۃ[۶]

تم طبیب ہو اور ہم عطار ہیں

یعنی محدثین کا کام اچھی دوائیں جمع کرنا اور فقیہوں کا کام دوا کی جانچ پڑتال کرکے اس کو برمحل منطبق کرتا ہے۔

حدیث سے دلچسپی رکھنے والوں کے تین گروہ

دراصل حدیث سے تعلق رکھنے والوں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) جو حدیث کی نقل و روایت میں زیادہ مشہور رہیں۔

(۲) جو حدیث کی نقد و درایت میں زیادہ مشہور رہیں

(۳) جو حدیث کی روایت و درایت دونوں میں مشہور رہیں۔

پہلے میں وہ محدثین ہیں جو فقہ میں ممتاز نہ تھے دوسرے میں وہ فقہا ہیں جو حدیث میں

[۶] ابن عبد البر جامع بیان العلم و فضلہ باب ذکر من ذم الاکثار الحدیث الخ

ممتاز نہ تھے۔ اور تیسرے میں وہ اہل علم ہیں۔ جو حدیث و فقہ دونوں میں ممتاز تھے۔

کم و بیش ہر گروہ کو درایت سے دلچسپی تھی

ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے۔ جس کو "درایت" سے دلچسپی نہ ہو کسی کو کم اور کسی کو زیادہ کیونکہ

ان دراستنا لمتن الحدیث	ہمارا متن حدیث کا مطالعہ اور کتب روایت
وعنایتہا بحفظ کتب الروایۃ	کی حفاظت کی طرف انہماک کوئی معنی نہیں
لیست شیئاً ان لم تکن	رکھتا اگر وہ درایتی علم حدیث پر مشتمل
مقترنۃ بعلم الحدیث درایۃً[1]	نہ ہو۔

ہر طبقہ کو درایت سے دلچسپی ہونے ہی کا نتیجہ ہے، کہ حدیث کی شناخت کے لیے (اصول و ضوابط کے علاوہ) علامت مقرر کی گئی ہے جس تک رسائی "درایت" کے بغیر نہیں ہو سکتی، چنانچہ صحیح حدیثوں کے بارے میں ربیع بن خثیم" کا قول ہے۔

لہ ضوء کضوء النہار[2]	اس میں روشنی دن کی روشنی کی طرح ہوتی ہے

غلط حدیثوں کے بارے میں ہے۔

لہ ظلمۃ کظلمۃ اللیل[3]	اس میں تاریکی رات کی تاریکی کی طرح ہوتی ہے۔

ملا علی قاری کہتے ہیں۔

والاحادیث الموضوعۃ	موضوع حدیثوں میں ایک خاص قسم
علیہا ظلمۃ ورکاکۃ	کی تاریکی، سطحیت اور بے تکاپن

۱؎ ڈاکٹر صبحی صالح۔ علوم الحدیث و مصطلحہ الفصل الاول علم الحدیث روایۃ و درایۃ

۲و۳؎ الحاکم۔ معرفۃ علوم الحدیث ص ۶۲

ومجازفات بارزۃ تنادی	ہوتا ہے جو اس کے جعلی ہونے کو پکار
علی وضعہا واختلاقہا[4]	پکار کر کہتا ہے۔

حدیث کی شناخت کے لیے فنی ذوق کی ضرورت ہے

حدیث میں روشنی اور تاریکی کی پہچان کے لیے "فنی ذوق" کی ضرورت ہے جس کے لیے "درایت" لازم ہے۔

ابن دقیق العید کہتے ہیں۔

وحاصلہ یرجع الی انہ حصلت	حاصل یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
لہم لکثرۃ محاولۃ الفاظ	کے الفاظ کی بکثرت ممارست سے ایک
النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیئۃ	خاص قسم کی نفسی کیفیت حاصل ہوتی اور
نفسانیۃ وملکۃ قویۃ	ایسا مضبوط ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جن کے ذریعہ
یعرفون بہا ما یجوز ان	نبوت کے الفاظ کی معرفت ہوتی ہے کہ وہ
یکون من الفاظ النبوۃ وما لا یجوز[5]	کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں

علامہ بلقینی نے فنی ذوق کو اس طرح سمجھایا ہے۔

ان انسانا لو خدم انسانا سنین	اگر ایک شخص کسی کی برسوں خدمت
وعرف ما یحب وما یکرہ	کرے اس کی پسند و ناپسند سے واقفیت
فادعی انسان انہ کان	حاصل کرے اور پھر کوئی اس کی پسندیدہ
یکرہ شیئا یعلم ذلک	شے کے بارے میں کہدے کہ وہ اس کو
انہ یحیہ فیہ بسماعہ	ناپسند کرتا ہے تو سننے کے ساتھ ہی

۴؎ ملا علی قاری۔ موضوعات کبیر فصل و من جملۃ علی امور کلیۃ الخ ۵؎ علامہ سخاوی فتح المغیث الموضوع۔

بیاد رسالی تکن یہید[1] اس کو جھوٹا قرار دیدیگا اور مزید تحقیق کی ضرورت نہ سمجھیگا

داخلی نقد حدیث کے اصول وضوابط

ذیل میں داخلی نقد حدیث کے اصول وضوابط بیان کئے جاتے ہیں جن سے ایک طرف حدیث قبول کرنے کا بلند معیار سامنے آتا ہے اور دوسری طرف حدیث کی اصل دریافت کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ ہر اصول وضابطہ کے ساتھ مثالیں بھی ذکر کی جاتی ہیں۔ تاکہ دوسری روایتوں کو ان پر قیاس کرنا آسان ہو۔

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث میں رکاکت پائی جاتی ہو؛

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث میں کسی قسم کی لفظی ومعنوی رکاکت (سطحیت) پائی جائے۔

زین الدین عراقی کہتے ہیں۔

وربما یعرف بالرکاکۃ

بسا اوقات حدیث کی وضعیت رکاکت سے معلوم کی جاتی ہے[2]

ملا علی قاری کہتے ہیں۔

ومنھا رکاکۃ الفاظ الحدیث وسماجتھا بحیث یمجھا السمع ویدفعھا الطبع[3]

وضعی ہونے کی پہچان حدیث کے الفاظ کی رکاکت اور خرابی ہے جو سننے والے کو ناگوار ہو اور طبیعت اس کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔

رکاکت کی دو قسمیں ہیں۔

---

[1] ڈاکٹر مصطفےٰ سباعی۔ السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی۔ علامات الوضع فی المتن۔

[2] شمس الدین محمد سخاوی۔ فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث۔ الموضوع۔ [3] ملا علی قاری۔ موضوعات کبیر فصل ونحن ننبہ علی امور کلیۃ

(الف) لفظی اور (ب) معنوی۔

لفظی رکاکت

لفظی رکاکت یہ ہے کہ الفاظ وجملوں میں فصاحت وبلاغت کے معیار اور قواعد عربیہ کی خلاف ورزی ہو جس کو دیکھ کر

لیعلم العارف باللسان ان مثلہ لا یصدر عن فصیح اللسان فضلا من ان یکون کلام النبی صلی اللہ علیہ وسلم[1]

عربی زبان کا ماہر جان لے کہ اس قسم کا کلام کسی فصیح اللسان کا نہیں ہو سکتا چہ جائے کہ رسول اللہ کا کلام ہو (جو افصح ترین تھے۔)

شاہ عبدالعزیز محدث کہتے ہیں۔

"رکاکت لفظ مثلاً لفظے روایت کند کہ در قواعد عربیہ درست نشود"[2]

ظاہر ہے کہ لفظی رکاکت کا تعلق ان ہی الفاظ سے ہوگا جن کے بارے میں صراحت ہو کہ یہ رسول اللہؐ کے الفاظ ہیں، اور ان کے نقل کرنے میں کسی قسم کا تصرف نہیں کیا گیا ہے۔

لکنہ فی اللفظ وحدہ مقید بما اذا صرح بانہ لفظ الشارع[3]

لفظی رکاکت اس صورت کے ساتھ مقید ہے کہ جس میں رسول اللہ کے الفاظ ہونے کی صراحت ہو۔

معنوی رکاکت،

(ب) معنوی رکاکت یہ ہے کہ معنی ومفہوم میں نادانی وکم عقلی

---

[1] مولانا عبدالحی لکھنوی ظفر الامانی فی مختصر الجرجانی۔ الموضوع۔ [2] شاہ عبدالعزیز عجالہ۔ خاتمہ۔ [3] فتح المغیث۔ الموضوع

کی بات پائی جائے جو شان نبوتؐ سے فروتر ہو۔ اور کلام معیار نبوتؐ سے گر جائے۔

ان یکون مشتملا علی سخافات وسماجات یصان عنہا الفضلاء[1]

حدیث کم عقلی و بھونڈے پن پر مشتمل ہو کہ جس سے عقلا محفوظ رہتے ہیں۔

ابن قیمؒ کہتے ہیں۔[2]

ویمج معناہا للفطن

اور عقلمند کے لیے اس کے معنی ناگوار ہوں۔

شاہ عبدالعزیزؒ کہتے ہیں۔

"رکاکت معنی کہ مناسب، شان نبوت و وقار بنا شد[3]"

رکاکت کے تحت چند موضوع حدیثیں۔ اس اصول کے تحت یہ حدیثیں موضوع قرار پائی ہیں۔

الدیک الابیض صدیقی وصدیق صدیقی وعدو عدوی[4]

سفید مرغ میرا دوست ہے اور میرے دوست کا دوست ہے اور میرے دشمن کا دشمن ہے۔

اربع لا یشبعن من اربع ارض من مطر وانثی من ذکر وعین من نظر وعالم من علم[5]

چار کو چار سے شکم سیری نہیں ہوتی، (۱) زمین کو بارش سے (۲) عورت کو مرد سے (۳) آنکھ کو دیکھنے سے اور (۴) عالم کو علم سے۔

---

۱ السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی علامات الوضع فی المتن۔ ۲ ابن قیم المنار المنیف فصل ۲۳ ومن امارات الحدیث، ۳ شاہ عبدالعزیز عجالہ نافعہ خاتمہ ۴ ملا علی قاری موضوعات کبیر باب المعالی۔ ۵ ایضاً باب الہمزہ

لا تاکلوا القرعۃ حتی تذبحوہا[1]

"کدو" کو ذبح کیے بغیر نہ کھاؤ۔

انما الباذنجان شفاء من کل داء ولا داء فیہ[2]

بینگن میں ہر بیماری کی شفا ہے اور اس میں کوئی بیماری نہیں ہے۔

علیکم بالعدس فانہ مبارک وانہ یرق لہ القلب ویکثر الدمعۃ وانہ قد بارک فیہ سبعون نبیا[3]

"مسور" کو استعمال کرو اس میں برکت دی گئی ہے اس سے دل نرم ہوتا اور آنسو زیادہ ہوتے ہیں اس کے لیے ستر نبیوں نے دعا کی ہے۔

اکرموا البقر فانہا سید البہائم ما رفعت طرفہا الی السماء حیاء منذ عبد العجل[4]

گائے کی عزت کرو وہ جانوروں کی سردار ہے جب بچھڑے کی پرستش کی گئی اس نے شرم کی وجہ سے اپنی آنکھ آسمان کی طرف نہیں اٹھائی۔

من فارق الدنیا وہو سکران دخل القبر سکران وبعث من قبرہ سکران وامر بہ الی النار سکران الی جبل یقال لہ سکران[5]

نشہ کی حالت میں جس کی موت ہوئی وہ قبر میں نشہ کی حالت میں داخل ہوگا۔ اسی حالت میں قیامت کے دن اٹھایا جائیگا اسی حالت میں آگ کی طرف لے جانے کا حکم ہوگا ایک پہاڑ کی طرف لے جانے کا حکم ہوگا۔ جس کا نام سکران ہے۔

---

۱ فتح المغیث الموضوع ۲ محمد طاہر پٹنی تذکرۃ الموضوعات باب البقول۔ ۳ ایضاً باب الحبوب من العدس۔ ۴ ایضاً صنوف الحیوان، ۵ ابن قیم المنار المنیف فصل ۲۳ ومنہا رکاکۃ الخ

ان للہ ملکا اسمہ عمارۃ علی فرس من حجارۃ الیاقوت طولہ مد بصرہ یدور فی البلدان ویقف فی الاسواق فینادی الا لیغل کذا وکذا الا لیرخص کذا وکذا۔[1]

اللہ کے ایک فرشتہ کا نام "عمارۃ" ہے۔ جو یاقوت کے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے، منتہائے نظر تک اس کی لمبائی ہے۔ بازاروں میں وہ ٹھہرتا ہے اور پکار کر کہتا ہے کہ اس قدر گرانی کر دو اور اس قدر سستا کر دو۔

رکاکت سے متعلق درج ذیل میں اصول بھی ہیں۔

رسول اللہؐ کی طرف منسوب حدیث میں خوبصورت چہرہ کی تعریف مختلف انداز سے ہو،	(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث میں خوبصورت چہرہ کی تعریف ان کی طرف

دیکھنے اور ان سے حاجت طلب کرنے کا حکم یا آگ کا عذاب انکو نہ ہونے کی خبر ہو۔

ابن قیم کہتے ہیں۔

کل حدیث فیہ مدح حسان الوجوہ والثناء علیہم او الامر بالنظر الیہم والتماس الحوائج منہم او ان النار لا یمسہم فکذب مختلق وافک مفتری۔[2]

ہر ایسی حدیث جس میں خوبصورت چہرہ کی تعریف وتوصیف ہو ان کی طرف دیکھنے اور ان سے حاجت طلب کرنے کا حکم ہو یا آگ کا عذاب ان کو نہ ہونے کی خبر دی گئی ہو تو یہ حدیث گڑھا ہوا جھوٹ اور بہتان ہے۔

لہ ابن قیم المنار المنیف فصل ۲۳ و منہا رکاکۃ ۱ ۔ کے ابن قیم۔ المنار المنیف فی الصحیح والضعیف فصل ۱۲۔

ملا علی قاریؒ نے بھی یہ اصول نقل کیا ہے۔[3]

اس کے تحت چند موضوع حدیثیں	اس کے تحت درج ذیل حدیثیں موضوع قرار پاتی ہیں۔

النظر الی الوجہ الحسن یجلی البصر۔[4]

خوبصورت چہرہ کی طرف دیکھنا نگاہ کو تیز کرتا ہے۔

علیکم بالوجوہ الملاح والحدق السود فان اللہ یستحیی ان یعذب ملیحا بالنار۔[5]

حسین چہرے اور بڑی سیاہ آنکھ والے کی ہم نشینی اختیار کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ حسین چہرہ کو آگ کا عذاب دینے سے شرماتا ہے۔

النظر الی الوجہ الجمیل عبادۃ۔[6]

خوبصورت چہرہ کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔

ثلاثۃ تزید فی البصر النظر الی الخضرۃ والماء الجاری والوجہ الحسن۔[7]

تین چیزوں کی طرف دیکھنے سے نگاہ میں تیزی پیدا ہوتی ہے (۱) سبزہ زار (۲) خوبصورت چہرہ (۳) آب رواں،

اس اصول کے تحت موضوع قرار پانے والی بہت سی حدیثیں ہیں ان میں دو کی طرف سے زیادہ مدافعت کی جاتی ہے۔

(۱) اذا بعثتم الی بریداً فابعثوہ حسن الوجہ والاسم۔[8]

جب میرے پاس کوئی قاصد بھیجو تو اچھے نام اور خوبصورت چہرہ والے کو بھیجو۔

اس میں "عمر بن ارشد" ایک راوی ہے جس کو جمہور نے ضعیف قرار دیا۔ اور ابن

لہ ملا علی قاری۔ موضوعات کبیر فصل و تحن نسبۃ ۲ و ۳ موضوعات کبیر ص ۱۱۲ مطبع مجدی دہلی ایضاً

ایضاً

حبانؔ نے واضعین حدیث میں شمار کیا ہے، غالباً اسی وجہ سے ابن جوزیؒ نے اس حدیث کو موضوعات میں ذکر کیا ہے۔ لیکن امام غزالی نے خوبصورتی سے سڈول جسم اور متناسب اعضاء مراد لئے ہیں، جس کی طرف دیکھنے سے طبیعت ابا نہ کرے، وہ خوبصورتی مراد نہیں ہے جس کو انسان دیکھتا ہے۔[۱]

(۲) اطلبوا الخیر عند حسان الوجوہ[۲]	خوبصورت لوگوں سے خیر و بھلائی (اپنی ضرورت) مانگو۔

بعض روایتوں میں، "اطلبوا" کی جگہ "ابتغوا" اور "التمسوا" آیا ہے۔ جلال الدین سیوطی وغیرہ بعض محدثین نے اس کو موضوع قرار نہ دینے پر اصرار کیا ہے۔ لیکن ابن عباسؓ کی وضاحت سے بات صاف ہو جاتی ہے۔ جب ان سے کہا گیا کہ

کم من رجل قبیح الوجہ قضاء للحوائج	بہت سے بدصورت ضرورتیں پوری کرنے والے ہیں۔

تو انھوں نے جواب دیا۔

انما یعنی حسن الوجہ عند الطلب۔[۳]	مراد طلب کے وقت خندہ روئی سے پیش آنا ہے (نہ کہ خوبصورت چہرہ)

اس وضاحت کے بعد ظاہری خوبصورتی کے موقع پر اس قسم کی حدیثوں کو استعمال کرنا صحیح نہیں ہے۔

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث میں مختلف پیشوں اختیار کرنے والوں کی برائی ہو

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث میں مختلف پیشوں اور

[۱] عبد الفتاح ابو غدہ تعلیق المنار المنیف فصل ۱۲ ص ۶۳ [۲] موضوعات کبیر ص ۱۴ [۳] العجلونی یا کشف الخفاء ج ۱ ص ۱۶۰ تعلیق المنار المنیف فصل ۱۴۰۔

ان کے اختیار کرنے والوں کی برائی بیان کی گئی ہو۔

وحدیث ذم الحائکۃ والاساکفۃ والصواغین او صنعۃ من الصنائع المباحۃ کذب علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذ لا یذم رسولہ الصنائع المباحۃ۔[۱]	پارچہ بافوں، موچیوں اور سناروں یا مباح دستکاریوں سے کسی دستکاری کی برائی کرنے والی حدیث رسول اللہ پر جھوٹ ہے، اللہ اور اسکا رسول مباح دستکاریوں کی برائی نہیں کرتا۔

اس کے تحت چند موضوع حدیثیں

اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی حدیثیں موضوع قرار پاتی ہیں۔

اکذب الناس الصباغ[۲]	رنگریز سب سے زیادہ جھوٹا ہوتا ہے۔
اذا کان یوم القیمۃ نادی منادٍ اینما خونۃ اللہ فی الارض فیولی بالنحاسین والصیارفۃ والحائکۃ[۳]	جب قیامت کے دن پکارنے والا پکاریگا کہ زمین میں اللہ کی خیانت کرنے والے کہاں ہیں تو ٹھٹھیروں، صرافوں اور کپڑا بننے والوں کو پیش کیا جائے گا۔
شرار امتی الصائغون والصائغون[۴]	میری امت کے بدترین لوگ دستکار اور سنار ہیں۔
ویل للصانع من غد وبعد غد[۵]	دستکار کے لیے خرابی ہے کل اور کل کے بعد

[۱] ابن قیم، المنار المنیف فصل ۲۳ [۲] دکاکۃ الخ [۳] کنز العمال کتاب البیوع الباب الرابع فی المکاسب المحظورۃ الاکمال [۴] ایضاً [۵] ایضاً متفرقات المکاسب المحظورۃ

بخلاء امتی الخیاطون[1] — میری امت کے بخیل درزی ہیں۔

یحشر اللہ الخیاط الخائنین وعلیہ قمیص ورداء مما خاط وخان فیہ[2] — اللہ تعالٰی خیانت کرنے والے درزی کو اٹھائیگا تو اس کے اوپر وہ کپڑے قمیص اور چادریں ہونگی جن میں اس نے خیانت کی ہے۔

شرار الناس التجار والزراع[3] — تاجر اور کاشتکار بدترین لوگ ہیں۔

ایسی بہت سی روایتیں ہیں جن میں مختلف پیشوں کی برائی۔ پیشہ والوں سے سلام کرنے کی ممانعت۔ ان کی روزی میں برکت نہ ہونے اور ان کی عقل سلب ہوجانے کی خبر اور دوسری خلاف واقعہ باتوں کا ذکر ہے۔ مثلاً

من ادرک منکم زمانا تطلب فیہ الحاکۃ العلم فالھرب[4] — جو شخص تم میں سے ایسا زمانہ پائے جس میں کپڑا بننے والے علم حاصل کریں تو اس سے دور بھاگو۔

لا تستشیروا الحجامین والحاکۃ ولا تسلموا علیہم[5] — سینگی لگانے والوں اور کپڑا بننے والوں سے نہ مشورہ کرو اور نہ ان سے سلام کرو۔

من اطلع فی طراز حائک خف دماغہ ومن کلم حائکا بخر فمہ ومن مشی مع حائک انقطع رزقہ ھم الذین — جو شخص کپڑا بننے والے کے کرگہ میں دیکھے گا اس کا دماغ ہلکا ہو جائیگا، اور جولاہے سے بات کرے گا اس کا منہ گندہ ہو جائیگا اور جولاہے کے ساتھ چلے گا۔ اس کا رزق

---

[1] محمد طاہر فتنی تذکرۃ الموضوعات باب اسبابہ وعقودہ المذمومۃ الخ [2] ایضاً اسبابہ وعقودہ المذمومۃ

[3] ایضاً باب اسبابہ وعقودہ المحمودۃ الخ [4] تذکرۃ الموضوعات باب اسبابہ وعقودہ المذمومۃ [5] ایضاً

بالوا فی الکعبۃ وسرقوا غزل مریم وعمامۃ یحیی بن زکریا وسمکۃ عائشۃ من التنور واستدلتھم مریم علی الطریق فدلوھا علی غیر الطریق[1] — اٹھ جائے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے کعبہ میں پیشاب کیا تھا۔ حضرت مریمؑ کا سوت اور حضرت یحییٰؑ کا عمامہ چرایا تھا، اور تنور نے حضرت عائشہؓ کی مچھلی چرائی تھی اور حضرت مریمؑ نے ان سے راستہ پوچھا تو غلط راستہ بتایا تھا۔

اس حدیث میں معلم کا بھی ذکر ہے۔

لا تستشیروا الحاکۃ ولا المعلمین فان اللہ سلبھم عقولھم ونزع البرکۃ من کسبھم[2] — کپڑا بننے والوں اور معلموں سے مشورہ نہ طلب کرو، اللہ نے انکی عقلیں سلب کر لی ہیں اور ان کی کمائی سے برکت اٹھا لی ہے۔

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث میں خاندان۔ قوم اور شہر کی برائی ہو،

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث میں خاندان۔ قوم یا شہر کی برائی ہو۔

ابن قیم و ابن جوزی کہتے ہیں۔

احادیث ذم الحبشۃ والسودان کلھا کذب[3] ومنھا احادیث ذم الترک[4] و احادیث ذم الخصیان [احادیث ذم الممالیک] — حبشہ اور سوڈان کی برائی سے متعلق حدیثیں سب جھوٹ ہیں، اسی طرح ترک کی، خصی اور غلاموں کی برائی سے متعلق حدیثیں بھی جھوٹ ہیں۔

---

[1] تذکرۃ الموضوعات باب السیاسۃ وعقودہ المذمومۃ۔ [2] ایضاً [3] المنار المنیف فصل ۲۴ ص ۲۵، [4] ص ۳۰ کبیر فصل ومنھا احادیث ذم الحبشۃ الخ ومنھا احادیث ذم الترک الخ

العلل المتناهیۃ فی الاحادیث الواهیۃ۔ میں شہروں کی فضیلت و برائی پر ایک مستقل باب ہے۔ جس میں بہت سی موضوع حدیثیں ذکر کی گئی ہیں [۱]۔

اس کے تحت چند موضوع حدیثیں | مذکورہ اصول کے تحت اس قسم کی حدیثیں موضوع قرار پاتی ہیں۔

الزیدیۃ مجوس	زیدی "اس امت کے مجوسی ہیں۔
هذہ الامۃ ان مرضوا	اگر وہ بیمار ہوں تو ان کی عیادت نہ کرو
فلا تعودوا ھم وان	اور اگر مر جائیں تو ان کے جنازہ میں
ماتوا فلا تشھدوھم [۲]	نہ جاؤ۔
الزنجی اذا شبع زنی و	حبشی جب شکم سیر ہوتا ہے تو زنا کرتا ہے
اذا جاع سرق [۳]	اور جب بھوکا ہوتا ہے تو چوری کرتا ہے۔
اتقوا الیھود والھنود و	یہودیوں اور ہندوؤں سے بچو اگرچہ
ولو سبعین بطنا [۴]	ستر پیٹ میں ہوں۔

---

[۱] ابن جوزی العلل المتناھیۃ (مخطوطہ) احادیث فی فضل بلدان و ذم بلدان ص ۹۔

[۲] محمد بن عبد الرحمن السخاوی: المقاصد الحسنۃ حرف الزاء [۳] تذکرۃ الموضوعات باب مدح العرب و لغتھم الخ [۴] ایضاً

فارسی کے چند نایاب ہندوستانی تذکرے

از

جناب محمد توحید عالم صاحب ریسرچ فیلو شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی

فارسی کا وطن اصلی ایران ہے۔ تقریباً ایک ہزار سال تک اس شیریں زبان کی نشو و نما ہندوستان کی مقدس سرزمین پر بھی ہوئی۔ اس عرصہ میں خاص ہندوستانی زبانوں کے مقابلہ میں بھی فارسی کو کہیں زیادہ مقبولیت اور شہرت حاصل رہی۔ ہندوستان میں مغلوں کا عروج فارسی کے عروج کے لئے نیک شگون ثابت ہوا اور مغلوں کے زوال کے ساتھ ہی فارسی کی ہزار سالہ بنیاد بھی متزلزل ہو گئی۔ اس دور اقتدار میں، فارسی زبان نظم و نثر دونوں دولتوں سے مالا مال ہوئی۔ نظم و نثر میں جو شاہکار وجود میں آئے ان میں سے ایک اہم فن تذکرہ نویسی ہے۔ فارسی تذکرے کئی صورتوں میں مرتب کئے گئے۔ بادشاہوں، وزیروں، امیروں اور صوفیاء، اولیاء، شیوخ کے علاوہ مفسرین، محدثین کے تذکرے بھی لکھے گئے۔ لیکن ان سبھوں کے مقابلہ میں شعراء کے تذکروں کو نسبتاً زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ تذکرے ایران اور ہندوستان دونوں ہی جگہوں میں لکھے گئے۔ ایرانی تذکروں کی مجموعی تعداد اگرچہ زیادہ ہے، لیکن دسویں صدی ہجری سے تیرہویں صدی ہجری کے

وسطی زمانے تک ہندوستان میں جتنے تذکرے لکھے گئے۔ وہ معیار اور تعداد دونوں
اعتبار سے ایرانیوں کے ہم پلہ ہیں۔ خاص طور پر بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری ہندوستان
میں تذکرہ نویسی کے شباب کا دور ہے۔

ہندوستان میں فارسی شعراء کے جتنے تذکرے فارسی میں لکھے گئے اُن کی مجموعی تعداد
کا تعین دشوار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں بہت سے تذکرے حوادث اور دستبرد زمانہ
کی نذر ہو گئے۔ اب جتنے تذکرے موجود ہیں۔ ان کی تعداد تقریباً اٹھاسی (۸۸) ہے۔[1] یہ تذکرے
مطبوعہ یا مخطوطہ کسی نہ کسی شکل میں دنیا کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ان تذکروں کے
علاوہ مکمل یا نامکمل شکل میں کچھ ایسے تذکرے بھی وجود میں آئے جو آج ناپید ہیں۔ اور
کہیں کے ان کے وجود کا سراغ نہیں ملتا۔ ان کا علم موجودہ تذکروں سے ہوتا ہے جن میں
ان تذکروں کو ماخذ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یا کسی دوسری شکل میں ان کا ذکر کیا گیا
ہے۔ اس مضمون میں اختصار کے ساتھ ایسے چند تذکروں کا تعارف کرایا جاتا ہے، جو
آج نایاب ہیں۔

(۱) آفتاب عالمتاب ــــ یہ تذکرہ ۱۲۶۹ھ کی تالیف ہے لیکن اتنا قریبی
عہد کا ہوتے ہوئے بھی آج ناپید ہے۔ اس تذکرہ کا علم مظفر حسین صبا کے تذکرہ روز روشن
سے ہوتا ہے۔ صبا نے اپنی تالیف میں آفتاب عالمتاب کے کئی اقتباسات نقل کئے ہیں۔ اور
یہ تذکرہ مستقل طور پر روز روشن کا ماخذ رہا ہے۔

آفتاب عالمتاب کا مولف قاضی محمد صادق خاں اختر کلکتہ میں ہوگلی کا باشندہ تھا۔
مقامی انگریز حکام کی نظروں میں اس کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ بعد میں شاہان اودھ کی

۱؎ تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان مولفہ علی رضا نقوی، مطبوعہ تہران؛

ملازمت سے منسلک ہوگیا اور مستقل طور پر لکھنؤ میں رہنے لگا۔ غازی الدین حیدر نے اس کی
بڑی قدر افزائی کی یہاں تک کہ اس کو ملک الشعراء کا خطاب بھی عطا کیا۔ آخری تاجدار
اودھ واجد علی شاہ کے عہد میں بھی اختر کی مقبولیت قائم رہی۔ اور لکھنؤ ہی میں ۱۸۵۷ء
میں اختر کی وفات ہوئی۔

اختر اپنے عہد کا نامور عالم و فاضل تھا۔ جملہ علوم و فنون میں دستگاہ حاصل تھی۔
اور ادبیات عجم و عرب پر حاوی تھا۔ اس کی تالیفات میں سے چند قابل ذکر کتابیں یہ ہیں۔[1]

(۱) محامد حیدریہ (۲) لوامع النوادر فی وجوہ المنثور
(۳) آفتاب عالمتاب (۴) حدیقۃ الارشاد
(۵) نثر در مدح یمین الدولہ (۶) تذکرہ آفتاب عالمتاب

(۲) تذکرۂ اشرف ــــ اس تذکرہ کا انکشاف بھی روز روشن ہی سے ہوا ہے۔
اشرف دہلوی کا حال تحریر کرتے ہوئے صبا نے اس تذکرہ کو ان سے منسوب کیا ہے۔
اشرف دہلی کا رہنے والا تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے ہنگامہ (۱۱۷۰ھ) کے بعد لکھنؤ چلا گیا اور
شاعروں کا ایک تذکرہ آصف الدولہ بہادر (متوفی ۱۲۱۲ھ) کے نام منسوب کر کے نواب
موصوف کی خدمت میں پیش کیا، تقریباً ۸۵ سال کی عمر میں اشرف کی وفات ہوئی۔[2] اس کے
تذکرہ کا آج وجود نہیں۔

(۳) تذکرۂ حیرت ــــ یہ تذکرہ بھی بارھویں صدی ہجری کے آخری عہد کا ہے۔
اس کا مولف قیام الدین حیرت ہے۔ اس تذکرہ کا بھی کوئی وجود نہیں، اس کا علم سفینہ
ہندی کے مولف بھگوان داس ہندی کے اس بیان سے ہوتا ہے جو انھوں نے حیرت کے

۱؎ تذکرہ روز روشن و شمع انجمن؛ ۲؎ روز روشن ص ۴۸،

ذکر میں کیا ہے۔ حیرت کا وطن اکبر آباد (آگرہ) تھا اور اس کے باپ کا نام شیخ امان اللہ تھا جو اسی شہر میں کسی ملازمت سے وابستہ تھا۔ حیرت خود معلم پیشہ تھا۔[1]

(۴) تذکرۂ سرور ——— یہ منظوم تذکرہ تیرہویں صدی ہجری میں لکھا گیا۔ اسکا علم بھی روز روشن سے ہوتا ہے۔ مولف روز روشن نے لالہ بیت پرشاد سرور کے حال میں لکھا ہے کہ سرور قوم کا کایستھ اور شاہ جہاں پور (دہلی) کا رہنے والا تھا۔ تاریخ گوئی کا ماہر تھا۔ اور تذکرۂ آفتاب عالمتاب مولفہ صادق خاں اختر کی تالیف کے وقت تک زندہ تھا۔ اسی سے زیادہ کی عمر پائی تھی۔ اس نے شعرا کا ایک تذکرہ لکھا تھا جس میں ہر شاعر کے حال اور اس کی تعریف میں ایک رباعی منظوم کی تھی۔[2]

(۵) تذکرۂ طبیعت ——— اس تذکرہ کا مولف شیخ سیف الدین محمد ہے۔ جو اکبر آباد (آگرہ) کے مضافات کا باشندہ تھا۔ اس نے ایک تذکرۂ شعرا مرتب کیا تھا۔ جو آج نایاب ہے۔ بھگوان داس ہندی نے اپنے سفینہ میں طبیعت کا حال تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اصلش از اعیان مشایخ الورمن توابع اکبر آباد است، تحصیل علم متداولہ از عبدالجلیل بلگرامی و دیگر فضلای نامی نمودہ، صاحب فضل و کمال گشت، تذکرۃ الاولیا، و تذکرۃ الشعراء نیز تالیف کردہ، در سنہ یکہزار و یکصد و چہل و ہفت در الہ آباد مولف ریاض الشعراء صحبت داشتہ۔"[3]

افتخار دولت آبادی نے طبیعت کی وفات کی تاریخ ۱۶ محرم ۱۱۵۵ھ ہجری تحریر کی ہے۔[4]

---

[1] سفینۂ ہندی ص ۲۰؛ [2] روز روشن ص ۲۹۰؛ [3] سفینۂ ہندی
[4] تذکرۂ بے نظیر ص ۹۶؛ نیز ملاحظہ ہو شمع انجمن اور تذکرۂ حسینی؛

(۶) تذکرۂ منیر لاہوری ——— منیر لاہوری گیارہویں صدی ہجری کا مشہور شاعر ہے۔ تقریباً سبھی اہم تذکروں میں اس کا ذکر موجود ہے۔ لیکن کسی نے اس کو صاحب تذکرہ نہیں قرار دیا۔ صرف نواب ابراہیم خلیل نے اپنے تذکرہ (صحف ابراہیم) کے ماخذ میں اس تذکرہ کا نام لیا ہے۔[1]

مولانا ابوالبرکات منیر ملا عبدالمجید ملتانی کے لڑکے تھے۔ ان کی پیدائش لاہور میں ہوئی۔ اور وہیں ان کی تعلیم و تربیت کا زمانہ بسر ہوا۔ پہلے "سخن سنج" تخلص کرتے تھے بعد میں منیر اختیار کیا۔ منیر نے جہانگیر اور شاہ جہاں دونوں حکمرانوں کا دور دیکھا۔ اور اس عہد کے نامور امرا کی صحبت میں زندگی بسر کی۔ منیر کی وفات عین جوانی میں ۱۰۵۴ھ ہجری میں اکبر آباد میں ہوئی اور انھیں لاہور لے جاکر دفن کیا گیا۔[2]

تذکرۂ منیر کے متعلق غالب کا قیاس یہ ہے کہ ۱۰۵۰ھ سے ۱۰۵۴ھ کے درمیان اس کی تالیف ہوئی۔[3]

(۷) تذکرۂ وارستہ ——— سیالکوٹی مل وارستہ ہندو شاعروں اور فارسی دانوں میں اہم مقام رکھتا ہے۔ وارستہ سیالکوٹ کا باشندہ اور نظم و نثر دونوں پر قادر تھا۔ اس کی ایک اہم تصنیف مصطلحات الشعرا، فارسی محاورات اور اصطلاحات کی تشریح میں لغت کی حیثیت سے فارسی کی اہم تالیف سمجھی جاتی ہے۔ اور اسی کی وجہ سے وارستہ کا مقام فارسی ادب کی تاریخ میں زندہ و بلند ہے،

---

[1] صحف ابراہیم دیباچہ؛ [2] پرشین لٹریچر ان انڈیا ڈیورنگ دی ٹائم آف جہانگیر اینڈ شاہجہان، ص ۱۴۸؛ [3] تاریخ تذکرہ ہائے فارسی ج ا ص ۳۷۷؛

وارستہ کے حالات زندگی پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے کہ میر محمد رائج سیالکوٹی اس کے استاد تھے۔ عمر کا آخری حصہ وارستہ نے ڈیرہ غازی خاں میں بسر کیا۔ اور یہیں ۱۱۸۰ھ میں وفات پائی۔ وارستہ کی تصنیفات میں کسی دیوان کا وجود نہیں، البتہ اس کی دوسری تالیفات یہ ہیں۔[1]

(۱) مصطلحات الشعراء (۲) مطلع السعدین ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(۳) صفات کائنات یا عجائب و غرائب (۴) جواب شافی یا رجم الشیاطین (۵) جنگ زنگار رنگ

ان تصنیفات میں تذکرۂ وارستہ کا کہیں وجود نہیں۔ اسپرنگر نے اپنی فہرست میں اس کا ذکر کرتے ہوئے۔ لکھا ہے کہ "یہ وارستہ کی بیاض ہے جس میں مختلف شعراء کے عمدہ اشعار جمع ہیں۔ مضامین کے لحاظ سے ۲۰، عنوان قائم ہیں، شعراء کے سوانح کا التزام نہیں کیا گیا ہے[2] لیکن تذکرہ بے نظیر کے مولف سید عبدالوہاب افتخار دولت آبادی نے آزاد بلگرامی کا حال قلمبند کرتے ہوئے وارستہ کے تذکرہ کا ذکر جس طرح پر کیا ہے وہ اسپرنگر کے بیان سے بالکل مختلف ہے افتخار لکھتا ہے کہ اس نے وارستہ کا تذکرہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا، لیکن ایک شخص نے اس تذکرہ کا دیباچہ نقل کر کے اس کے پاس بھیجا تھا۔ افتخار کا بیان ہے کہ وارستہ نے اس تذکرہ میں آزاد بلگرامی پر سخت اعتراضات کئے تھے۔[3]

مولف بے نظیر نے جس طرح اس تذکرہ کا خاکہ کھینچا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وارستہ کا یہ تذکرہ تنقیدی اور تحقیقی اعتبار سے بڑا اہم رہا ہوگا۔

(۸) جواہر زواہر —— مولف تذکرۂ اختر تاباں نے اپنے ماخذوں کا

[1] ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ ۲۴۲ تا ۲۴۹؛ [2] اودھ فہرست اسپرنگر ص ۱۴۰؛ [3] تذکرہ بے نظیر ص ۵۰۰؛

ذکر کرتے ہوئے اس تذکرہ کا نام لیا ہے، اور مشہور شاعر و مورخ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کو اس کا مولف قرار دیا ہے،[1] تعجب ہے کہ شفیق کی تصنیف میں اس تذکرہ کا ذکر نہیں، اس کی تالیفات میں شاعروں کے دو تذکرے گل رعنا اور شام غریباں کے نام سے موجود ہیں، لیکن جواہر زواہر کے نام کا اس کا کوئی تذکرہ اب موجود نہیں ہے البتہ اردو شاعروں کا ایک تذکرہ شفیق نے ضرور لکھا ہے جس کا نام چمنستان شعراء ہے، اور انجمن ترقی اردو نے اس کو شائع کیا ہے۔

شفیق کا نام لچھمی نرائن تھا۔ وہ رائے منسا رام کا لڑکا تھا۔ منسا رام نواب نظام الملک آصف جاہ کا پیشکار تھا۔ شفیق کی ولادت ۱۱۵۸ھ میں ہوئی۔ اس نے پہلے صاحب اور آخر میں شفیق تخلص اختیار کیا۔ شیخ عبدالقادر مہربان اس کے ابتدائی استاد تھے اور آخری دور میں اس نے میر غلام علی آزاد بلگرامی جیسے مقتدر عالم اور شاعر سے استفادہ کیا، پھر نواب نظام علی خان کی ملازمت سے وابستہ ہوا۔ اور نواب صمصام الدولہ کے عہد میں "دولت چند" کے منصب اور لقب سے نوازا گیا۔[2]

شفیق کا سنہ وفات سخنوران بلند فکر (اردو) کے مولف نے ۱۲۰۱ھ لکھا ہے۔ لیکن یہ تاریخ بالکل غلط ہے کیونکہ اس کے ۱۳ یا ۱۴ سال بعد کی شفیق کی تالیف بساط الغنائم موجود ہے۔ گل رعنا مطبوعہ حیدرآباد دکن کے فصل دوم کے سرورق پر ایک تاریخ ۱۲۲۳ھ درج ہے۔ اس کا ماخذ تو معلوم نہیں، مگر اس کی تائید و تصدیق شفیق کے ایک لائق شاگرد غلام مصطفےٰ خان سخن کے دیوان کے ایک قطعہ سے ہوتی ہے۔ شفیق کی وفات پر اس نے ایک قطعہ لکھا ہے جس کے

[1] اختر تاباں، ص ۴، [2] ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ ص ۱۰۹،

ایک شعر سے سال وفات نکلتا ہے۔ ؎

سال رحلت رقم نمود سخن　　"رائے مشاطۂ معانی رفت"[1]
۱۲۲۳ھ

شفیق کثیر التصانیف تھا۔ اس نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں

کتابیں لکھیں، اس کی فارسی تصانیف یہ ہیں۔

(۱) حقیقتہائے ہندوستان (۱۲۰۴ھ) (۲) تمنیق شنگرف (۱۲۰۰ھ)

(۳) مآثر آصفی (۱۲۰۸ھ) (۴) مآثر حیدری (　　) (۵) انباط الغنائم (۱۲۱۴ھ)

(۶) خلاصۃ الہند (　　) (۷) حالات حیدر آباد (۱۲۱۴ھ) (۸) چمنستان

شعراء (۱۱۷۵ھ) (۹) شام غریباں (۱۱۸۲ھ) (۱۰) گل رعنا۔ (۸۲-۱۱۸۱)

(۹) حدیقۂ ہندی ——— بھگوان داس ہندی کا یہ تذکرہ سفینۂ ہندی

کے نام سے مقبولیت اور شہرت حاصل کر چکا ہے۔ ہندی نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"سابق در سنہ یکہزار و دویست تذکرہ حدیقۂ ہندی مشتمل بر حالات شعرا

ماضی دحال کہ در ہند تولد یا نشو دنما یافتہ اند بقید قلم شکستہ رقم درآوردہ و

بعضی علوم مفیدہ ہم درو مندرج نمودہ، دان حدیقہ ایست جانفزا و تالیفی

است دلکشا"[2]

اسی تذکرہ میں ہندی نے اپنے حال کے ضمن میں لکھا ہے:۔

"تذکرۂ حدیقۂ ہندی مشتمل بر حالات شعرائی ماضی دحال کہ در ہندوستان

جنت نشان تولد یا نشو دنما یافتہ اند از ابتدائی ظہور اسلام تا سنہ یک

ہزار و دویست ہجری، تالیف نمودہ، چنانچہ آن تالیف ہم تذکرہ ہم نامہ نخستست"[3]

---

[1] رسالہ آج کل اپریل ۱۹۶۱ء میں نفیسہ شوکت صاحبہ کا مضمون ملاحظہ ہو۔ [2] سفینۂ ہندی دیباچہ [3] ایضاً ص ۲۴۷؛

ان دونوں تحریروں سے ظاہر ہے کہ ہندی نے ایک اور تذکرہ "حدیقۂ ہندی"

کے نام سے ۱۲۰۰ھ میں تالیف کیا تھا۔ لیکن اس تذکرہ کا آج کوئی وجود نہیں۔

بھگوان داس دلپت داس بن ہربنس رائے کا لڑکا تھا۔ دلپت داس نواب

برہان الملک بہادر (متوفی ۱۱۵۱ھ) کے عہد سے نواب آصف الدولہ بہادر (۱۱۸۹ھ۔

۱۲۱۲ھ) کے آخری زمانہ تک اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔[1]

بھگوان داس کی ولادت ۱۱۶۴ھ میں صید پور (سیلک) کے مقام پر

اپنے ننیہال میں ہوئی، دو سال بعد وہ باپ کے پاس لے جایا گیا۔ اور باپ ہی کے

دامن تربیت میں اس کی نشو دنما ہوئی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد جوانی ہی میں "میر بحر"

کے عہدہ پر فائز ہوا۔ الہ آباد کا پورا صوبہ نواب مختار الدولہ کی طرف سے اس کے

ماتحت تھا۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں راجا جھاؤ سنگھ بہادر کا دیوان مقرر ہوا

اور پانصدی منصب ملا۔ راجا مذکور کی موت کے بعد پرتاپ چند بہادر کا مصاحب ہوا پھر اسکی

وفات کے بعد مہاراجا ٹکیت رائے زمیندر (متوفی ۱۲۱۵ھ) کا مصاحب ہوا۔ آخر میں

ہندی راجا جے سنگھ رائے کی ملازمت میں رہا۔ اس نے ہندی کی بڑی قدر دانی کی۔[2]

ایک زمانہ میں ہندی سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں (نائب آصف الدولہ) کا

دیوان بھی رہا تھا۔[3]

انتظامی اور سیاسی مشغولیتوں کے باوجود بھگوان داس نے علم و ادب سے اپنا

تعلق قائم رکھا، آغاز شباب ہی سے شاعری شروع کر دی تھی ابتدا میں بسمل، پھر

---

[1] سفینۂ ہندی ص ۲۴۲؛ [2] ایضاً ص ۴۳-۲۴۲؛ [3] انگریزی دیباچہ سفینۂ ہندی مرتبہ پروفیسر عطاء الرحمٰن صاحب عطا کاکوی مدظلہ؛

ہندی تخلص اختیار کیا، شاعری میں ناخر مکین کی شاگردی میں تھا۔

بھگوان داس کے آخری دور کا حال معلوم نہیں حتیٰ کہ سال وفات بھی نامعلوم ہے۔ اس کی تصنیفات کی فہرست یہ ہے۔[1]

(۱) مثنوی سلسلۃ المحبت، (سلسلۃ الذہب جامی اور قران السعدین خسرو کے وزن میں) (۲) مثنوی مظہر الانوار (مخزن الاسرار نظامی کے وزن میں) (۳) مثنوی بھاگوت مسمی بہ بحر ضیا (جامی کی مثنوی یوسف زلیخا کے وزن میں) (۴) دو دیوان فارسی (شوقیہ اور ذوقیہ کے ناموں سے)، (۵) تذکرۂ حدیقۂ ہندی (زیر بحث) (۶) رسالہ سوانح النبوۃ (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوازدہ اماموں کے سوانح پاک)، (۷) تذکرۂ سفینۂ ہندی (فارسی شعراء کا تذکرہ جو ۱۲۱۹ھ میں لکھا گیا۔)

(۱۰) حیات الشعراء ——— اس تذکرہ کا مولف محمد علی خاں کشمیری ہے، اس کا تخلص متینؔ تھا۔ بارہویں صدی ہجری کے نصف آخر میں اس نے ایک تذکرہ تالیف کیا تھا۔ جس کا آج کوئی وجود نہیں۔ تذکرۂ بے نظیر کے مولف نے متینؔ کشمیری کے حال میں اس تذکرہ کو متینؔ کی تصنیف قرار دیا ہے۔ مولف بے نظیر کے بیان کے مطابق حیات الشعراء میں بہادر شاہ اول کے زمانہ (۱۱۱۹ھ۔ ۱۱۲۴ھ) سے لیکر محمد شاہ کے عہد (۱۱۳۱ھ۔ ۱۱۶۱ھ) تک کے فارسی شعراء کا حال تھا۔ اس تذکرہ کو متینؔ نے اپنے محسن اور مخدوم اغر خاں ترک جنگ تخلص دیدہ کے نام سے منسوب کیا تھا۔ تذکرۂ بے نظیر کی عبارت یہ ہے:۔

"متینؔ محمد علی خان با اغر خان ترک "جنگ" دیدہ" تخلص پسر می برد۔ . . .

[1] ان تمام کتابوں سے صرف آخری دستیاب ہے، دوسرے کا کوئی وجود باقی نہیں۔

. . . بنام او تذکرۃ الشعرائی مسمی بہ حیات الشعراء تالیف کردہ وصاحب طبعان عہد خلد منزل بہادر شاہ را تا عصر فردوس آرام گاہ محمد شاہ بقید تحریر در آوردہ"[1]

عبدالحکیم لاہوری مولف تذکرۂ مردم دیدہ نے بھی شاہ آفریں لاہوری کے حال میں متینؔ کے تذکرہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"محمد علی خان متین پسر حسام الدین متوطن کشمیر در تذکرۂ خود این بیت شاہ آفریں را باندک تغیر مطلع بنام خویش نوشتہ:۔

در مشربے کہ ما ئیم آلودہ دامنی نیست
ساغر بکف چو تصویر، رندیم و پارسائیم

حال آنکہ این فقیر سی سال پیش ازین، بیت مذکورہ را در دیوان مرحوم دیدہ و در سخن جہان لاہور بیت مذکور بنام شاہ مرحوم اشتہار دارد"[2]

متینؔ اپنے عہد کے اچھے شاعروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اور کشمیر کے فارسی شعراء میں اس کا درجہ ممتاز تھا۔ اکثر تذکروں میں اس کا ذکر ہے۔ متینؔ دہلی میں اغر خاں ترک کے ساتھ رہتا تھا۔[3] جو محمد شاہ کے عہد میں پنج ہزاری منصب پر فائز تھا۔ اور جنگ دیدہ تخلص کرتا تھا۔

(باقی)

[1] تذکرۂ بے نظیر ص ۱۱۳ ؛ [2] مردم دیدہ ص ۲۲ ؛ [3] اس کا مفصل حال مآثر الامراء ج ۱ ص ۲۶۴ ، اور مردم دیدہ، ص ۱۲۳ میں ملاحظہ ہو؛

مولوی عبدالحق

از

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب، دہلی یونیورسٹی دہلی

جس وقت میں نے ہوش کی آنکھ کھولی ہے، مولوی عبدالحق صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ سرسید کے حاشیہ نشیں۔ حالی کے جانشین، اُردو کے عاشقِ صادق، جامعہ عثمانیہ کے بانیٔ خاص، دارالترجمہ کے روحِ رواں، عثمانیہ یونیورسٹی اور دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر، علی اور انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔ مہاتما گاندھی، مسز سروجنی نائیڈو، سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر تاراچند اور سر کیلاش ناتھ ہاکسر سے ان کے بے تکلفانہ مراسم تھے۔ انھوں نے اُردو کی جو گراں قدر خدمات انجام دی تھیں، ان کا میرے دل پر بڑا گہرا نقش تھا۔ جی چاہتا تھا، کہ ہر معاملہ میں ان کی نقل کروں۔ ان کی سی عبارت لکھوں۔ اس میں وہی سادگی ہو۔ وہی پُرکاری ہو، میرا خط بالکل ان کا سا ہو جائے۔ وہی دائرے ہوں، وہی کشش ہو۔ جس طرح اُنکے دل میں مقصد کی لگن ہے ایسا ہی سوز، آرزو میرے دل میں بھی پیدا ہو جائے۔ کام کے جو معمولات انکے ہیں، ان کی پیروی میں بھی کر سکوں۔ رسالہ اُردو میں ۱۹۴۳ء سے مضامین لکھتا رہتا تھا۔ اس لیے اُن سے قلمی ملاقات بھی تھی لیکن ابھی تک سامنے

گفتگو کی نوبت نہیں آئی تھی۔

اس ملاقات کی تقریب بڑی دلچسپ ہے۔ کانپور میں ایک بڑے مالدار تاجر تھے، حافظ محمد صدیق ــــ ان سے میرے خصوصی مراسم تھے۔ جب بھی ملاقات ہوتی فرماتے "فاروقی صاحب میں شاہ جہاں ہوں اور میرا یہ لڑکا اورنگ زیب ہے۔ اس نے مجھے قید میں ڈال دیا ہے، لیکن میں بھی اسے ایک پیسہ نہیں دونگا۔ عاق کر دونگا، محروم الارث کر دونگا۔ ساری دولت فقیروں میں بانٹ دونگا۔ وصیت کر جاؤنگا کہ اس بدبخت کو ایک حبہ بھی نہ ملے۔"

پہلے پہل تو میں اسے مذاق سمجھتا رہا۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ وہ واقعی سنجیدہ ہیں اور یہ چاکِ دامن کسی طرح رفو نہیں ہو سکتا تو میں نے انتہائی کوشش کی کہ وہ یہ گرانقدر رقم قومی اداروں کو، بطور عطیہ کے دے دیں۔ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد سے دہلی تو آگئی تھی۔ لیکن اس کی مالی حالت لائقِ رشک نہیں تھی۔ مولوی صاحب نے ایثار کرکے اپنا سارا اندوختہ اور پراویڈنٹ فنڈ کا سارا روپیہ انجمن کو دیدیا تھا۔ اس لیے بھی جی چاہتا تھا کہ حافظ محمد صدیق انجمن کو ایک بڑا عطیہ دے دیں۔ بالآخر اس میں کامیابی ہوئی اور پچاس ہزار کا چک ہاتھ میں آگیا۔ لیکن یقین کیجیے کہ اس سعی اور پیروی میں میری جوتیاں ٹوٹ گئیں اور رگِ سنگ سے لہو ٹپکنے لگا۔ میں نے مولوی صاحب کو پوری روداد لکھی اور گزارش کی کہ وہ تشریف لاکر حلیم کالج کانپور کے جلسے میں چک لے لیں۔ مولوی صاحب نے لکھا: "وہ بلاشبہ شاہ جہاں ہے لیکن قسم ہے خدا کی کہ آپ بھی سعد اللہ خاں سے کم نہیں۔ بڑا کام کیا آپ نے۔"

میں مولوی صاحب کو لینے اسٹیشن گیا۔ ان کی تصویر بارہا دیکھی تھی۔ فوراً

پہچان لیا۔ اور قیام گاہ پر لے آیا۔ لیکن اب مولوی صاحب ہیں کہ مجھ سے خفا ہیں۔ بڑے ناراض۔ "میاں میں تو تمھارے خطوں سے اور مضامین سے یہ سمجھا تھا کہ تم ۵۵ یا ۶۰ برس کے آدمی ہو گے۔ تم نکلے بالکل نوجوان۔ نوعمر۔ لونڈے۔ بڑا دھوکا دیا تم نے۔"

مولوی صاحب سے پہلی دفعہ ملا تو یہ معلوم ہوا کہ صدیوں کا علم و ادب، اس کی بے شمار یادیں اور ہزاروں عاشقوں کا اضطراب ان کی شخصیت میں سمو گیا ہے۔ وہ محبت سے گالیاں بھی دیتے تھے۔ لیکن عجیب تاثیر تھی ان کی گالیوں میں۔ میں کبھی ان کی گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا۔

اس ملاقات کے بعد مولوی صاحب سے بڑی خصوصیت پیدا ہو گئی۔ اور انھوں نے بھی وہ سلوک کیا جو آبا اپنی اولاد کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ اپنے مخطوطات تک مجھے دیکھنے اور پڑھنے کے لیے دے دیتے تھے۔ بڑا اصرار کر کے رسالہ اردو کے لیے مضامین لکھوائے۔ نئی کتابوں پر تبصرے کی فرمائش کی جو "خ ا ف" کے نام سے رسالہ اردو میں شائع ہوئے۔ بڑا رنج انھیں کہ میں کوردہ کانپور میں پڑا سڑ رہا ہوں۔ کہنے لگے "رجب علی بیگ سرور کو بھی یہاں سزا کے طور پر بھیجا گیا تھا۔ آخر یہاں سے نکلتے کیوں نہیں؟" ۴۵ء میں انھوں نے مجھے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کی ڈائرکٹری پیش کی۔ فیضی صاحب اور بذل الرحمٰن صاحب نے طرح طرح سے لکھا اور سمجھایا لیکن بمبئی میں بڑے پیمانے پر فسادات ہو رہے تھے۔ میری والدہ، اللہ بخشے، کسی طرح اتنی دور پرائیوٹ نوکری پر بھیجنے کے لیے آمادہ نہ ہوئیں۔ اس کے بعد لکھنؤ اور ڈھاکہ کی ریڈری کے لیے اصرار کیا۔ لیکن وہاں کے لیے بھی قدم نہ اٹھے۔ بالآخر ۴۶ء میں

اینگلو عربک کالج دہلی میں اردو کے لکچرر کی ایک جگہ خالی ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالحق اس وقت دہلی یونیورسٹی میں اردو کے اعزازی پروفیسر تھے۔ اور ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی دریا گنج میں رہتے تھے۔ انتخابی کمیٹی میں ڈاکٹر عبدالحق، اور ڈاکٹر ذاکر حسین، اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی بہ حیثیت ڈین شامل تھے۔ یہ قرعۂ فال میرے نام پڑا۔ اس وقت سے کہ ۲۰ برس ہو گئے ہیں۔ دلی کا روڑا ہوں۔ اور یہ دلی کی گلیاں کسی طرح سے نہیں چھٹتیں۔

۴۷ء کے فسادات میں میں پرانے قلعہ میں تھا اور مولوی صاحب بھوپال میں شعیب قریشی صاحب کے پاس تھے۔ بھوپال سے وہ برابر میری پرسش حال کرتے رہے اور بڑا شدید اصرار کیا کہ "میرے ساتھ کراچی چلیے۔"

میں نے عرض کیا "مولوی صاحب آپ بھی مت جائیے۔"

کہنے لگے "یہاں لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔"

میں نے عرض کیا "تو اردو بچ جائے گی۔ گر ایں سودا بجاں بودے چہ بودے"

مولوی صاحب بہت بدخط ہوئے: "بڑے گدھے ہو۔ ناسمجھ ہو۔ ٹھہر جاؤ حقیقت معلوم ہوگی۔" میں برابر ... اصرار کرتا رہا کہ "مولوی صاحب کہیں اور اجازت ہو نہ ہو۔ آپ کے حضور میں تو حق گوئی اور بیباکی کی اجازت ضرور ہونا چاہیے۔"

مولوی صاحب کراچی چلے گئے۔ لیکن ۱۳ر جنوری ۴۸ء کو پھر دلی آئے۔ وہ اگلے روز گاندھی جی سے ملنا چاہتے تھے۔ جن سے ان کی خوب یاد اللہ تھی۔ لیکن انھوں نے برت شروع کر دیا تھا۔ اس لیے ملاقات نہ ہو سکی۔

اس مرتبہ مولوی صاحب نے ۲۵ جنوری ۵۳ء کو ایک جلسہ بھی ہمدردانِ اُردو کا علی گڑھ کے اولڈ بوائز لاج میں منعقد کیا۔ اس میں مَیں بھی تھا۔ ذاکر صاحب بھی۔ عابد صاحب بھی۔ مولوی صاحب کا خیال تھا کہ "اس جلسے میں جو لوگ تھے۔ وہ ڈرے سہمے ہوئے تھے۔ وہ انجمن ترقی اُردو کی آیندہ پالیسی کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں کر سکتے تھے یا وہ صاف صاف کچھ کہنا نہیں چاہتے تھے۔"

۳ اکتوبر ۵۴ء کو مولوی صاحب پھر کراچی سے دہلی تشریف لائے اور اس مرتبہ خلیق منزل چوڑی دالان دہلی میں قیام فرمایا۔ عبدالرحمٰن صدیقی صاحب بھی جو بعد میں مشرقی بنگال کے گورنر ہو گئے تھے، ان کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ مجھے حکم ہوا کہ فوراً آکر ملوں۔ میں فوراً حاضر نہ ہو سکا۔ میری بچی عذیرہ۔ مرض الموت میں گرفتار تھی۔ جب اس کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہوا۔ تو حاضر خدمت ہوا۔ مولوی صاحب نے دروازے سے میری ٹانگ لی: "حضرت یہ اچھی تقسیم ہوئی کہ دل بھی بٹ گئے، مراسم تعلقات سب سینت کے رکھ دیئے۔ اتنے دن کے بعد آئے ہیں آپ۔ شرم نہیں تمھارے نام کی۔"

میں نے معذرت چاہی اور سبب بتلایا۔

فرمایا۔ "یہ تو خفگی کی تمہید تھی۔ مجھے اصل ناگواری آپ کے اُن خیالات سے ہے۔ جو آپ نے نقوش لاہور کے تازہ شمارے میں ظاہر فرمائے ہیں میں پوچھتا ہوں دماغ سڑ گیا ہے تمھارا" اس کے بعد انھوں نے نقوش کا رسالہ دراز سے نکال کر سامنے ڈال دیا۔ اور عبدالرحمٰن صدیقی صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا دیکھیے صاحب کیا جھک مارا ہے۔ انھوں نے۔"

صدیقی صاحب نے اسے قرأت کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ میں نے اُردو کے مستقبل کے بارے میں لکھا تھا کہ "میں پاکستان میں اُردو کے مستقبل کے بارے میں زیادہ خوش امید نہیں ہوں۔ اس لیے کہ وہاں کا کوئی علاقہ ایسا نہیں ہے جہاں مائیں اپنے بچوں کو اُردو میں لوریاں دیتی ہوں۔ وہاں بنگال میں بنگالی، پنجاب میں پنجابی، سندھ میں سندھی بلوچستان میں بلوچی اور سرحد میں پشتو بولی جاتی ہے۔ ہندوستان اُردو کا گھر ہے۔ یہ بعض دوسری ہند آریائی زبانوں کی طرح گنگا جمنا کے دوآب میں پلی اور بڑھی ہے۔ اگر یہاں کی اُردو آبادی اسے قائم رکھنا چاہتی ہے۔ تو وہ قائم رہے گی۔ اور اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔"

یہ بات عبدالرحمٰن صدیقی صاحب اور مولوی عبدالحق صاحب دونوں کو بہت ناگوار گزری، دونوں سب و شتم میں کمال رکھتے تھے۔ دونوں بہت دیر تک مطعون کرتے رہے۔ جب لے بہت بڑھ گئی تو میں نے بڑے ادب سے عرض کیا۔ "آپ دونوں میرے بزرگ ہیں۔ میں بجز اس کے اور کیا عرض کر سکتا ہوں کہ یہ لسانیات کا مسئلہ ہے۔ زور سے بولنے سے طے نہیں ہو سکتا ہے۔

اس واقعہ کے بعد مولوی صاحب ناراض ہو گئے۔ ان کو اُردو سے اتنی محبت تھی کہ اس پر وہ ہر محبت کو قربان کر دینے کے لیے تیار تھے۔ خط و کتابت بند۔ مراسم تہنیت و تعزیت ختم۔ مجھے ساہتیہ اکاڈمی کا انعام ملا۔ میر تقی میر چھپی۔ کوئی خط نہیں البتہ رسالہ اُردو میں ریویو کیا۔ اور اُس میں کتاب کی خوب خوب تعریف کی۔

غالباً ۱۹۵۱ء کی بات ہے۔ مولوی صاحب ڈھاکہ گئے اور انھوں نے وہاں جاکر اُردو کی اشاعت کے سارے جتن کیے لیکن کامیابی نہیں ہوئی

آخر مایوس ہو کر کراچی چلے آئے اور مجھے برسوں کے بعد خط لکھا:

"تم سے خلیق منزل میں پاکستان میں اُردو کے مستقبل کے بارے میں گفتگو
ہوئی تھی اور میں بہت خفا ہوا تھا۔ تمھارے خیالات سے لیکن اتنے عرصہ
ڈھاکہ میں رہتے اور پاکستان میں کام کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ تم صحیح
کہتے تھے۔ اور میں غلطی پر تھا۔ معذرت خواہ ہوں۔"

یہ مولوی صاحب کی بڑائی تھی کہ انھوں نے ایک بچہ کی بات کو اتنی اہمیت دی
اور مجھ سے معذرت ضروری سمجھی۔

اِس خط کو پڑھ کر مجھے کون راد کی وہ کہانی یاد آگئی۔ جو اس نے ایک مہاجر
سلاو کسان کی لکھی ہے۔ وہ گھر کی پریشانیوں سے اکتا کر ہجرت اختیار
کرتا ہے۔ اور کنٹ (Kent) کے ایک گاؤں میں رہنے لگتا ہے۔ یہاں کی زبان
مختلف، آب و ہوا مختلف، ماحول مختلف۔ ایک سیدھی سادی لڑکی اس پر ترس
کھاتی ہے۔ اشاروں اشاروں میں باتیں کرتی ہے اور کبھی کبھی روٹی کپڑا بھی دے جاتی ہے۔
بالآخر دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ ایک بچہ بھی ہو جاتا ہے۔ ایک روز یہ کسان بیمار پڑتا ہے،
اور سرسام کی حالت میں اپنی مادری زبان میں باتیں کرنے لگتا ہے۔ اُس وقت اس لڑکی
پر ایسی شدید اجنبیت کا احساس طاری ہوتا ہے کہ وہ بچے اور شوہر دونوں کو یوں ہی
چھوڑ کر فوراً گھر سے نکل جاتی ہے۔

۵۶ء میں میں یورپ جا رہا تھا۔ کراچی ہو کر گیا تاکہ مولوی صاحب سے نیاز
حاصل ہو سکے۔ بڑے بجھے بجھے سے نظر آئے۔ آواز میں وہ کڑک نہیں تھی۔ میں نے پوچھا
مولوی صاحب خیر تو ہے؟ مزاج کیسا ہے؟ انجمن کا کیا حال ہے؟ دونوں مترادف

الفاظ ہیں۔ لیکن آپ الگ الگ بتا دیجیے۔"

کہنے لگے: "ان حرام زادوں نے حاتم کی قبر پر لات مار کے صرف ۱۵ ہزار روپیہ
سالانہ انجمن کے لیے منظور کیے ہیں ـــــ میں ہندوستان میں مہابھارت کی لڑائی لڑتا رہا
اور بھیم اور ارجن کی طرح لڑا لیکن میاں، اپنوں کے ساتھ نہیں لڑا جاتا ع
طاقت کہ جس سے تابِ جفا تھی سو ہو چکی"

مولوی صاحب بڑے ٹھاٹ سے رہتے تھے۔ اچھا پہنتے تھے۔ اچھا کھاتے تھے۔ ان کا
نظریہ یہ تھا کہ "دودھ پینے سے دماغ بچوں کا سا ہو جاتا ہے۔ گوشت کھانے سے درندگی
پیدا ہو جاتی ہے۔ ترکاری سے آدمی انسان سے مویشی بن جاتا ہے۔ پھل اصل چیز ہے۔ صرف
پھل کھانا چاہیے۔"

لیکن آخر زمانہ میں ان کا جو حال تھا۔ اس کو سُن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ بیوی بچے تو
کوئی تھا ہی نہیں۔ دولت آشنا سب منحرف، نوکر چاکر دشمن۔ بعض تو پہچاننے کے بھی روادار
نہیں تھے۔ اور صرف لوٹ کھسوٹ پر آمادہ تھے۔ آخر زمانہ میں وہ مایوس ہو کر موت
کی دعا مانگنے لگے تھے۔ اس سے ان کی مایوسی کا اندازہ کیجیے۔ مالی حالت سقیم ہو گئی تھی موٹر
تک بیچنے کے لیے تیار تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میرا حال یہ ہے کہ میں نے سالن وغیرہ کھانا چھوڑ دیا ہے۔ کیری کی چٹنی پسوا
لیتا ہوں اور دو توس چٹنی سے کھا لیتا ہوں اور ایک اُبلا ہوا آلو۔ نمک مرچ سے
اللہ اللہ خیر سلاّ۔"

بالآخر ۹۱ برس کی عمر میں، ۱۶؍اگست ۱۹۶۱ء کو یہ بابائے اُردو، یہ حسرتِ موت،
یہ مردِ قلندر، قیدِ دنیا۔ اور بندِ اُردو دونوں سے آزاد ہو گیا ـــــ وہ شخص جو حیدرآباد میں

روز گرانڈ ٹرنک اکسپریس کو کہ وہ دہلی سے آتی تھی، گھنٹوں حسرت سے دیکھا رہتا تھا اب دہلی سے دور، بہت دور کراچی میں آسودہ خاک ہے۔ کراچی کی سرزمین سے اس سے زیادہ اور کیا عرض کروں کہ

ایں نورِ چشم ماست کہ در بر کشیدۂ

مولوی عبدالحق فرد نہیں، انجمن تھے۔ ایک عہد۔ ایک ادارہ۔ اگر ان کے کام سے قطع نظر کر لیا جائے تو اردو تہی دامن رہ جائے گی۔ اس کی تجدید اور ارتقا کے صفحے سادے نظر آئیں گے۔ ان کی کوشش سے انجمن ترقی اردو کی ۲۶۵ کتابیں شائع ہوئیں جو سب بلا استثنا اہم اور قابلِ قدر ہیں۔ انھوں نے اردو کی عمر بڑھادی۔ اور اس کی تاریخ میں دو سو سال کا اضافہ کیا۔ لسانیات، تنقید اور تحقیق کے نئے اسالیب قائم کیے۔ دکھنیات کا ذوق پیدا کیا۔ نادر مخطوطات شائع کیے۔ سائنس عمرانیات ادب۔ فلسفہ۔ معاشیات، تاریخ اور علوم جدیدہ پر نئی کتابیں لکھوائیں۔ ترجمے کروائے حیدر آباد کی جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ کے روحِ رواں وہی تھے۔ ان ہی کی کوشش سے مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، سر راس مسعود، مولانا عبدالحلیم شرر، مولانا وحید الدین سلیم، سید سلیمان ندوی، اور مولانا علی حیدر نظم طباطبائی حیدر آباد کے دامنِ دولت سے وابستہ ہوئے اور انھوں نے اردو کی مہتم بالشان خدمات انجام دیں۔ لغت، املا، ٹائپ، اصطلاحات اور قواعد کے میدان میں وہ کام انجام دیئے کہ اب تک ہم اس پر اضافہ نہیں کر سکے۔ ان کے اسلوب میں بلا کی سادگی اور پرکاری ہے اور یہ طرز حالی سے زیادہ شگفتہ اور دلکش ہے۔ ان کے خاکے، مقدمے اور ان کے خطوط جن کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے

خاصہ کی چیز ہیں۔ صرف ایک خط کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ انھوں نے خود بھی یہ دشوار گزار منزلیں سینے کے بل طے کی تھیں:

"زوال یافتہ قوموں کی ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ ان کے افراد میں حسد کا مادہ بے حد بڑھ جاتا ہے۔ وہ کسی کو کھاتا پیتا اور خوش حال یا ممتاز نہیں دیکھ سکتے۔ انھیں یہ بھی گوارا نہیں ہوتا کہ کوئی اچھا کام کرکے نام حاصل کرے۔ خواہ وہ کام انہی کے فائدہ کا کیوں نہ ہو۔"

مولوی عبدالحق نے باوجود مخالفتوں کے اردو کی گزرگاہوں کو روشن کیا۔ ایک نئی نسل کی تربیت کی اس کے دل میں اردو کے ذوق کی چنگاری اور کام کا سلیقہ پیدا کیا۔ ان کی عظمتِ کردار۔ ان کی قطب نما کی سوئی کی سی وفاداری، اردو سے عشق اور مقصد کی لگن۔ وہ اعلیٰ خوبیاں ہیں۔ جو ان کو بقائے دوام کے دربار میں جگہ دینے کے لیے کافی ہیں۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما۔

خواجہ عزیز الدین عزیز کی شاعری

از۔ جناب سید ضیاء الحسن صاحب استاد فارسی مجیدیہ اسلامیہ کالج الہ آباد

(۴)

خواجہ عزیز نے امرا کی شان میں جو قصائد لکھے ہیں۔ اُن میں سے دو بہت اہم اور قابل ذکر ہیں۔ پہلا قصیدہ در مدح آصف جاہ نواب میر محبوب علی خاں بہادر والئی ریاست حیدرآباد دکن ہے۔ اور دوسرا قصیدہ در مدح سلطان عالم واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ ہے۔ ان بادشاہوں کی جود و سخا سے کون واقف نہیں ہے۔ اگر خواجہ عزیز ذرا سا بھی اشارہ کرتے تو ان کی آرزو سے سوا دولت ان کے ہاتھ لگتی۔ لیکن خواجہ صاحب کی طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا کہ کسی کے سامنے دست سوال دراز کریں۔ وہ عام شعرا کی طرح سلاطین و امرا کی جھوٹی تعریفیں کر کے صلہ اور انعام کے کبھی طالب نہیں ہوئے۔ اپنے وقار کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ اور اپنی خودی کو برقرار رکھا۔ اس کی بہترین مثال ہمیں خواجہ صاحب کے اس قصیدہ میں ملتی ہے۔ جو انھوں نے آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کی شان میں لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

قریب ہست کہ آئی وجشن گاہ شود　　خرابۂ کہ ز ہجر تو ہست ماتم گاہ

منم کہ بود رمن صد سلام عجز آلود　　رسد نہ خطۂ شہرداں چہ شاہگہ چہ بیگاہ

نہ وصف تست کہ شوم سیہ تا شوی　　نہ مدح تست کہ نامم فتاد در افواہ

عزیز بس کن و تن زن کہ از مدائح شہ　　ز ہند صیت کلامت رسید تا بہراہ

ہمیشہ تا کہ منقش بود صحیفۂ باغ　　ہمارہ تا کہ مجدد نماید این خرگاہ

دل محبش خندان چو غنچۂ گل باد　　تن عدویش بیجان چو صورت دیباہ

اسی طرح سے خواجہ صاحب نے میر محبوب علی خاں نظام دکن کی شان میں جو قصیدہ کہا ہے ان کے بہترین قصائد میں ہے۔ کچھ اشعار اس کے بھی "مشتے نمونہ از خروارے" پیش خدمت ہیں

طرب باید بکن شکر و سپاس داور منان　　بجلش یونس از ماہی رہا شد سف از احزان

خود از احکام حق آمد موسیٰ گہ شراب آن آب　　ز لطف وے بابراہیم گہ گلزار شد نیران

بامر اللہ بگو آصف ز رنج جان نجات او دید　　بحمد اللہ بہا گہ رشتۂ نوح از ورطۂ طوفان

بہ بے باکی بمسے گو یا گمہ کرد و ست سوی شہ　　بگلشن دیدۂ عبہر ازیں ہردم بود حیران

چمن گر روزگار این گل برایں گل آیدان بلبل　　زمیں باشد فلک ماہ او جہاں تن آمدآں مہ جان

ہم او شاہی است داد آموز و ہم ماہے سما آرا　　ہم او مہرے ست دل افروز و ہم او سایۂ یزدان

بحمد اللہ ازیں موسم کہ آمد جشن صحت ہم　　دکن را نو شدہ دیگر ہیا از طرب سامان

شدہ صحت باد حاصل تو گوئی جلوہ آں دارد　　برآمد از سحاب ابر جان آور امہ تابان

جہانے باد داد او و امرا امرہیں بالطافش　　بود ہر یک ز رنج ایمن شدہ از جود او شادان

علو آستانش ہم سپہر آمد بجاہ و داد　　بطوف در گہش ہر دم دود ایں گنبد گردان

ہم او مرجود را آصف عزیز شمہ مدح او صف　　عزیز از ہست قاآنی و آصف آمدہ قاآن

بہ محبوب خدا ہم نام دے ہم بہر دو دے　　مبارک صحت این بادا ز بہر آصف گیہان

اس قصیدہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر شعر سے چار چار تاریخیں نکلتی ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ بڑے سے بڑے قادر الکلام شاعر مشکل سے اس

اس صنعت سے عہدہ برآ ہو سکے ہیں۔ وہ خود اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"از ہر شعر چہار تاریخ بر می آید یکے از مصرع اول و دوم از مصرع ثانی و سیوم

از حروف منقوط ہر دو مصرعہ و چہارم از حروف غیر منقوطہ ہر دو مصرع"۔ [۱]

قصیدۂ مذکورہ کے ہر شعر سے ۱۳۰۱ھ تاریخ نکلتی ہے۔ اسی طرح قصیدہ اورنگ حضوری کے ہر مصرعہ سے جو نظام کی مسند نشینی کی تقریب میں لکھا گیا ہے۔ تاریخ جلوس ۱۳۰۱ھ نکلتی ہے۔

ان قصائد کے علاوہ دیوان میں متعدد قصائد ہیں اور بقول ثمروانی صاحب "قاآنی کے طرز کا قصائد ہیں۔ خوب اتباع کیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔ [۲]

دو شم بگوش آمدہ کائے بندۂ خدا
از بند خود برآ ز در بندگی درآ

دستے فراز کن کہ نیازت شود قبول
صبحے نیاز کن کہ نمازت شود ادا

بردار سر ز بیش و ز جیب فلک برآر
بگذار پا بخویش و بہ عرش برین برآ

کبر تو خیر است چرا نشکنی ز ہم
نفسے تو کافر است چرا نفگنی ز پا

طوفے بکوئے عشق کہ ہم کعبہ ہم حرم
سعی ز روئے صدق کہ ہم مردہ ہم صفا

خواجہ عزیز اور حافظ شیرازی

خواجہ صاحب کے کلام میں جا بجا فارسی کے مشہور اساتذہ کا نام آیا ہے۔ وہ حافظ شیرازی سے خاص طور سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا نام بڑے ادب سے لیتے ہیں۔ ان کی پیروی کو اپنے لئے قابل فخر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

دادہ شمس الدین حافظ این فرغت ای عزیز

ورنہ این تا ثیر دولت از گدائی کوکب است

---

[۱] دیوان خواجہ عزیز ص ۱۱۵ [۲] مقدمہ دیوان عزیز ص ۱۲۔

حدیث حافظ شیراز و گفتہ ہائے عزیز

۲۔ ہماں حکایت تو رو دوز و بوریا باف است

کلک حافظ دہنم پر ز شکر کردہ عزیز

۳۔ ثمرے تازہ ازین شاخ نباتم دادند

شہد و شکر عزیز بشعرم نمی رسید

۴۔ تا ہر طریق حافظ شیرین زبان شدم

تا ز حافظ بگفت سلسلہ ہست عزیز

۵۔ دست در حلقۂ آں زلف دوتا نتواں کرد

خواجہ صاحب کی بعض غزلیں حافظ کی ہم ردیف و ہم قافیہ، بلکہ بہت سے اشعار ہم معنی یا قریب المعنیٰ ہیں اُن میں تخیل ضرور حافظ سے لیا گیا ہے۔ لیکن الفاظ کا جامہ خود خواجہ صاحب نے پہنایا ہے۔

یہاں ایک نکتہ قابل ذکر ہے۔ کہ بعض شاعر کسی متقدم شاعر کے کسی شعر کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس کے تخیل کو زیادہ حسین پیکر میں پیش کرے اور وہ بغیر سرقہ کی نیت کے متقدم شاعر کے شعر کے بڑھ جانے کی کوشش کرتا ہے، اس کوشش میں، کبھی کامیاب ہوتا ہے۔ اور کبھی ناکام رہتا ہے۔

اب ہم اس جملۂ معترضہ کے بعد اصل مضمون کی طرف آتے ہیں۔ اور خواجہ عزیز و حافظ شیرازی کے چند ہم معنیٰ اشعار پیش کرتے ہیں۔

فغاں زاں شوخ شر انگیز شیریں کار بے پروا

خواجہ عزیز۔ کہ می خواہد بکام خود زبان دادخواہاں را

حافظ شیرازی

فغاں کیں لولیانِ شوخ شیریں کارِ شہر آشوب
چناں بردند صبر از دل کہ ترکاں خوانِ یغما را

خواجہ عزیز

خدارا زود اے پیر طریقت دستگیری کن
شبِ تاریک و باریک و در چاہ و ما اعمیٰ

حافظ شیرازی

شبِ تاریک و بیم موج و گرداب چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا

خواجہ عزیز

بیا ساقی سرت گردم رواں کن کشتیٔ مے را
بسم اللہ مجریہا باذن اللہ مرسٰہا

حافظ شیرازی

اَلَا یَا اَیُّہَا السّاقی اَدِر کاساً وَ ناوِلہا
کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

خواجہ عزیز

خلافے گر دہد رو در طریقت دم مزن ہرگز
کہ عقل اینجا بود با عشق ہمراہ خضر و موسیٰ

حافظ شیرازی

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواجہ عزیز نے حافظ شیرازی کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اور اس کا اثر ان کے کلام پر پڑا ہے۔ مگر اس سے خواجہ صاحب کی شاعرانہ صلاحیت اور ان کی سخنوری پر حرف نہیں آتا۔

خواجہ عزیز اور نظیری | اسی طرح سے خواجہ صاحب نے نظیری اور ظہوری کا نام بھی لیا ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ہمارے کلام میں جو کچھ بھی تاثر ہے وہ کلام الہٰی "کا اثر ہے بقول علامہ اقبال۔؎

"یہ فیض ظہوری اور نظیری کا نہیں بلکہ کلام الہٰی کا ہے۔ اور خواجہ مرحوم کو خود اسکا احساس تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ ؏

کے از ظہوری و ز نظیری رشد عزیز	فیضے کہ از کلام الہٰی بما رسید"[1]

نظیری اور خواجہ صاحب کے بھی کلام میں خاصی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ طوالت مضمون کے پیش نظر دونوں کے صرف ایک ایک شعر پر اکتفا کرتے ہیں۔

خواجہ عزیز

خود بخود میوۂ جنت رسد از شاخ بلب
ہمت از کس پے آں سیب زنخداں مطلب

نظیری

رسن زلف پے حیلہ در آویختہ اند
جز دل تشنہ از ان چاہ زنخداں مطلب

خاتمہ | ہندوستان میں فارسی شاعری کا وہ دور جو اکبر کے زمانے سے شروع ہوا۔ خواجہ صاحب بقول اقبال" اس کی کڑی تھے۔ خواجہ صاحب کے زمانے ہی میں فارسی شاعری کا رواج ختم ہو گیا تھا۔ اور اس کی جگہ اردو شاعری نے لے لی تھی۔ تاہم خواجہ صاحب نے فارسی میں طبع آزمائی کی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان کا طبعی میلان فارسی ہی کی طرف تھا۔ دوسرے اس کو فارسی میں اسقدر دسترس تھی کہ وہ اپنے خیالات کو اردو کے مقابلہ میں فارسی میں زیادہ آسانی سے ادا کر سکتے تھے۔ غرض وجہ جو بھی ہو۔ ان کا کلام دور اکبری کی فارسی شاعری کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم بہ غور ان کے کلام کا مطالعہ کریں تو ان کے یہاں وہ ساری خصوصیات نظر آئیں گی۔ جو اس عہد کی شاعری میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔

---

[1] مکتوب علامہ اقبال منسلک بہ دیوان خواجہ عزیز لکھنوی۔

خیال اور طرز ادا کی جدت نے خواجہ صاحب کے کلام میں ایک حسن پیدا کر دیا۔ اس کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

طاقت کندن کا ہے بنود عاشق ۔۔۔ قصۂ کوہ کنی تہمت بے بنیاد است

این صبح سرکشیدہ بگردوں غبار کیست ۔۔۔ وین شام تیرہ دودِ دلِ بیقرار کیست

نباشد خالی این مضمون رنگیں از حنا بستن ۔۔۔ سرم گردم کہ میں بیگنہ را کشتن است امشب

بکیش عشق بر نخچیر فربہ نیست قربانی ۔۔۔ نمی خواہد محبت صید این فتراک شاہانرا

جز تجِ سادہ لب لعل نگارم ای عزیز ۔۔۔ آتش بے دخاں کجا بادۂ بے خمار کو

از شربت وصالت دز لذت فراقت ۔۔۔ ہر زخم را نمک ہست ہر درد را دوا نیست

خواجہ صاحب کی شاعری کے سلسلہ میں جتنا بھی مواد اکٹھا کیا جا سکا ہے اس کی حیثیت نقش اول سے زیادہ نہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ ان کی پوری شاعری پر باقاعدہ تحقیقی کام کیا جائے۔ اس مختصر مضمون میں اس کے تمام گوشوں کو اجاگر کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے کوشش یہ کی گئی ہے کہ فارسی علم و ادب کے ہندوستانی ذخیرہ میں جو خواجہ عزیز کا جو حصہ ہے۔ اس کی مکمل تصویر "نہ سہی" اس کا ہلکا سا خاکہ ضرور ان چند صفحات میں پیش کر دیا جائے۔

گل رعنا

اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اسکی شاعری کا آغاز، عہد بعہد کے اردو شعراء کا تذکرہ ولی سے لیکر حالی واکبر تک کے حالات۔ مولفہ مولانا سید عبدالحئی، سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

قیمت:۔ عیؔہ

باب التقریظ والانتقاد

انڈو ایرانیکا کا سلور جوبلی نمبر

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

معارف کے صفحات میں کلکتہ کے مشہور ادارہ ایران سوسائٹی کا ذکر بار بار آچکا ہے۔ یہ ادارہ فارسی زبان و ادب کی خدمت میں جس طرح لگا ہوا ہے، اس کے ذکر کے تکرار میں خوشی محسوس ہوتی ہے۔ ناظرین واقف ہوں گے کہ ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم نے اپنے غیر معمولی ذاتی انہماک اور مالی امداد سے اس کو ۱۹۴۲ء میں قائم کیا۔ اس کی طرف سے انڈو ایرانیکا کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ بھی جاری کیا۔ جو اسوقت سے اب تک برابر شائع ہو رہا ہے اور اپنے بلند پایہ مضامین اور عمدہ طباعت کی وجہ سے ہندوستان بلکہ بیرون ملک کے علمی رسائل میں بھی ایک نمایاں جگہ حاصل کر لی ہے۔

اس وقت اس کا سلور جوبلی نمبر زیر نظر ہے، اس کے شروع میں ہندوستان اور اس کے باہر کے مشاہیر کے بیانات ہیں۔ اس کے بعد حسب ذیل اعلیٰ معیار کے مضامین ہیں

(۱) عہد وسطیٰ میں ہندوستان میں لکھی ہوئی وہ تاریخیں جن سے شمالی اور جنوبی ہند میں روابط پیدا ہوئے۔ از پروفیسر ہارون خاں شروانی، مقالہ نگار کے اسم گرامی سے ہندوستان کے علمی حلقے میں کون واقف نہیں، اس مضمون میں انھوں نے سلاطین دہلی

اور مغل بادشاہوں کے دور کی متداول تاریخوں کے علاوہ محمود گاوان کی ریاض الانشاء، عزیز اللہ طباطبائی کی برہان مآثر، رفیع الدین شیرازی کی تذکرہ الملوک، ظہور بن ظہوری کی محمد نامہ، قاضی نور اللہ کی تاریخ عادل شاہی، قسونی استرابادی کی فتوحات عادل شاہی، ابراہیم زبیری کی بساتین السلاطین کے ساتھ نشاط نامہ شہریاری، نسب نامۂ قطب شاہ، تواریخ قطب شاہی، تاریخ محمد قطب شاہی، حدیقۃ السلاطین از نظام الدین احمد سعیدی شیرازی، حدیقۃ السلاطین فی کلام الخواقین از علی بن طیفور بسطامی وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ اس مضمون سے مفید ماخذوں کی ایک فہرست سامنے آجاتی ہے۔

دوسرے مضمون میں ڈاکٹر نذیر احمد صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے عوارف المعارف کے ایک قدیم ترین فارسی ترجمہ کی نشاندہی کی ہے۔ یہ ترجمہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی (المتوفی ۶۵۶ھ) کی حوصلہ افزائی اور سندھ کے حکمران تاج الدین کی فرمائش سے قاسم داؤد خطیب چر (؟) نے کیا۔ فاضل مقالہ نگار کا خیال ہے کہ یہ ترجمہ ۶۲۰ھ اور ۶۴۲ھ کے درمیان کیا گیا۔ ان کو اس کے دو نسخے ملے ہیں، ایک تو کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں ہے۔ اور دوسرا جناب میکش اکبرآبادی کے پاس محفوظ تھا جو آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی میں منتقل ہوگیا ہے۔ فاضل مقالہ نگار جس موضوع پر لکھتے ہیں، اپنی دیدہ ریزی اور دیدہ وری کا جوہر دکھاتے ہیں، اس مقالہ میں بھی ترجمہ کی ادبی اور لسانی نوعیت دکھانے میں اپنی علمیت کا پورا جوہر دکھایا ہے۔ اس میں عمید سنامی کا بھی ضمناً ذکر آگیا ہے، راقم نے اپنی کتاب بزم مملوکیہ میں اپنے اس قیاس کا اظہار کیا تھا۔ کہ عمید سنامی کا ایک مربی تاج الدین سنجر خان تھا۔ جو ناصر الدین محمود کے دربار کا ایک امیر تھا۔ مگر ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ عمید کا یہ سرپرست سندھ

اور ملتان کا آزاد حکمران تاج الدین ابوبکر بن عز الدین کبیر خان ایاز تھا۔ مگر عمید کے ایک قصیدہ میں یہ دو شعر ملتے ہیں۔

مدار مملکت بر و بحر تاج الحق　　کہ بحر قلزم غم ساخت از امان کشتی
سپہر مرتبہ سنجر کہ فتنہ زد یہ کرد　　بہ سوئے معبر دریائے قہر دان کشتی

پہلے مصرع سے سندھ کے حکمران ہونے کا تو گمان ہو سکتا ہے، مگر تیسرے مصرع میں "سنجر" سے شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ وہی تاج الدین سنجر تو نہیں جو ناصر الدین محمود کے دربار کا امیر تھا۔

تیسرے مضمون میں پروفیسر ڈاکٹر جگدیش نرائن جادو یونیورسٹی نے عماد الدولہ مرزا محمد وحید کے ترتیب دیے ہوئے رقعات شاہ عباس ثانی کے پانچ خطوط سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کے شیعی حکمرانوں نے ایران سے مل کر مغل سلطنت کے خلاف معاندانہ سازش کر رکھی تھی، اورنگ زیب کیلئے یہ بات لازمی طور سے ناقابل برداشت ہونی چاہیے تھی، اس لیے اس کا ان حکمرانوں کا مخالف ہونا حق بجانب تھا۔

چوتھا مضمون ڈاکٹر محمد اسحق مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ تحریر ہے، جس میں مختصر طریقہ سے گورگان کے ایک شاعر قمری کے اشعار کے کچھ نمونے اور ان کے انگریزی ترجمے دیے گئے ہیں۔

پانچواں مضمون راقم کا ہے۔ جس کا عنوان "ہندوستان کے فارسی ادب میں ہندوستان اور خصوصاً بنگال سے محبت اور تحسین کے جذبات" ہے یہ وہ مقالہ ہے جو ڈاکٹر محمد اسحق میموریل لکچرز کے سلسلہ میں ۱۳ ستمبر ۱۹۷۲ء کو ایران سوسائٹی میں پڑھا گیا۔

چھٹا مضمون پروفیسر سید حسن عسکری پٹنہ یونیورسٹی کا ہے، جو اپنی بے لوث علمی خدمت

کی وجہ سے بہت ہی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس میں انھوں نے ہندوستان کے مغل بادشاہوں کی بحری قوت کا جائزہ دے کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ انکی بحری فوج ان کی بری فوج کی طرح طاقت ور نہ تھی۔ اس لیے وہ فرنگیوں کی بحری قزاقی کو دبا نہ سکے۔ اورنگ زیب کو اپنی اس کمزوری کا احساس تھا، اس لیے وہ انگریز بحری تاجروں کو مراعات دیتا رہا، گو ان فرنگی تاجروں کے اختلافات سے فائدہ بھی اٹھانے کی کوشش کی اس مضمون کو کلمات طیبات عالمگیری اور احکام عالمگیری سے مستند معلومات فراہم کرکے باوزن اور پرمغز بنایا گیا ہے۔

ساتواں مضمون ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ڈیسائی کا ہے، جو ناگپور میں محکمۂ آثار قدیمہ کے روح رواں ہیں، اس کو پڑھ کر بہار والوں کو ضرور غیرت آئے گی کہ جو کام ان کے کرنے کا تھا، وہ صوبہ سے باہر کے ایک ماہر فن نے وہاں پہونچ کر انجام دیدیا۔ اس میں انھوں نے بڑی تحقیق اور محنت سے ریاست بہار کی ان تاریخی عمارتوں کا جائزہ لیا ہے، جو مسلمان حکمرانوں کے عہد میں تعمیر ہوئیں۔ معارف کے ناظرین بھی ذرا ان بھولی ہوئی عمارتوں کے کم سے کم نام سے واقف ہو جائیں، مقبرہ ملک ابراہیم بیو (بہار شریف) مقبرہ حضرت مخدوم سوستان (بہار شریف) سنگی مسجد (تلہاڑہ ضلع پٹنہ)، مقبرہ شاہ نافہ (مونگیر) مسجد چیرند (ضلع سارن)، مقبرہ شاہ جمن (دلہیا، ضلع پٹنہ)، حسن سور، شیر شاہ سور، اسلام شاہ سور اور عادل خان کے مقبرے (سہسرام)، مقبرہ بختیار خان (چین پور)، جامع مسجد (رہتاس)، قلعہ شیر گڈھ (نزد سہسرام)، حبش خان کی مسجد رہتاس گڈھ کا محل، مقبرہ مخدوم شاہ دولت (منیر)، سنگی مسجد (پھلواری شریف)، قلعہ پلاموں (چھوٹا ناگپور)، مقبرہ مخدوم صاحب چمپا نگر (نزد بھاگلپور)، جامع مسجد

(حاجی پور)، مسجد سنگی دالان (پٹنہ)، میر صاحب کے ٹولے کی مسجد (بہاری)، شاہ جنگی کی مسجد، منگلپورہ کی مسجد، خلیفہ باغ کی مسجد، مشائخ چک کی مسجد، مدرسہ کی مسجد (منیگھٹ پٹنہ)، خواجہ کلاں کی مسجد (پٹنہ)، مقبرہ شمشیر خان (شمشیر نگر گیا)، مقبرہ ابراہیم حسین خان بھاگلپور)، مقبرہ نواب منیر الدولہ (پٹنہ) وغیرہ، یہ مقالہ بہار والوں کے لیے ایک علمی نعمت ہے۔ وہ ان عمارتوں کو شاید بھول چکے ہوں مگر ان کے لیے اس مقالہ کے مفید معلومات سے پھر زندہ ہوگئی ہیں، فاضل مقالہ نگار کا خیال ہے کہ ان عمارتوں میں پہلے تو سلاطین دہلی کے طرز تعمیرات کے اثرات رہے، پھر بنگال کا طرز نمایاں ہوا اور جب سور خاندان کی حکومت ہوئی تو وہ اپنے خاص طرز کے بانی ہوئے، آخر میں مغلوں کے اثرات غالب ہوتے چلے گئے۔

آٹھویں مضمون میں ڈاکٹر آر۔ ناتھ آگرہ کالج، نے فتح پور سیکری اور آگرہ کی عمارتوں کے کتبات کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اکبر شروع میں راسخ مسلمان ضرور رہا لیکن رفتہ رفتہ وہ اسلام سے دور ہوتا گیا۔

نواں مضمون بو علی سینا کے عنوان سے جناب خواجہ محمد یوسف صاحب مینجنگ اڈیٹر انڈو ایرانیکا، کا ہے، خواجہ صاحب کلکتہ ہائی کورٹ کے لائق ایڈوکیٹ ہیں۔ اپنے پیشے کی مشغولیت کے باوجود علم وفن کے چمنستان میں بھی آکر گلگشت مستانہ کیا کرتے ہیں ان کا قلم مختلف سمتوں میں چلا کرتا ہے۔ بو علی سینا پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن خواجہ صاحب نے اپنے اس مضمون میں اپنے قلم کا اعجاز دکھا کر بو علی سینا کی عبقریت اور اس کی تصانیف سے متعلق ایسے مفید معلومات فراہم کر دیے ہیں کہ اس سے بہت کچھ استفادہ کیا جا سکتا ہے

آخری مقالہ ڈاکٹر امیر حسن عابدی صدر شعبۂ عربی و فارسی دہلی یونیورسٹی کا ہے،

جس میں انھوں نے ایران سوسائٹی کے جشن سیمین کی یادگاری جلد کے مضامین پر تبصرہ کر کے اس کی اشاعت پر ایران سوسائٹی کو مبارکباد دی ہے۔

انڈو ایرانیکا میں زیادہ تر انگریزی مضامین شائع ہوتے ہیں، لیکن اس میں کچھ فارسی مضامین بھی ضرور ہوا کرتے ہیں، زیر نظر سلور جوبلی نمبر میں ڈاکٹر عطا کریم برق (کلکتہ یونیورسٹی) کے دو مضامین ہیں، ایک انجمن بزم ایران در مدت چہار سال اخیر اور دوسرا نظری بہ نفوذ فرہنگ ایرانی در جنبہ ہای ادبی و فرہنگی بنگالہ کے عنوان سے ہے، ڈاکٹر عطا کریم برق ہندوستان کے ان چند ارباب قلم میں ہیں، جو فارسی زبان میں بہت ہی بے تکلف انداز میں مضامین لکھا کرتے ہیں، انھوں نے تاثیر فارسی در زبان و ادبیات بنگالی کے موضوع پر فارسی میں دو جلدیں مرتب کر لی ہیں، یہ شائع ہوئیں تو ہندوستان کے علمی حلقہ میں ایک مفید اضافہ ہو گا۔

فارسی میں ڈاکٹر سید امیر حسن، دہلی یونیورسٹی کا بھی ایک مضمون ہے جس میں انھوں نے تاریخ سلاطین صفویہ پر تبصرہ کیا ہے، ڈاکٹر صاحب موصوف اس وقت انڈو پرشین لٹریچر کے بڑے مستند عالم ہیں، انھوں نے ہندوستان کے بعض کمیاب فارسی نسخوں کو شائع کر کے ایسی مفید خدمت انجام دی ہے کہ ہندوستان کی فارسی زبان و ادب کی تاریخ میں ان کا نام برابر احترام کے ساتھ لیا جائے گا، وہ بھی فارسی بہت ہی بے تکلف لکھتے اور بولتے ہیں، زیر نظر مضمون ان کی بے تکلفانہ تحریر کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

اس حصہ میں جناب آقاے ہاشم کاردوش، رائزن فرہنگی (کلچرل اتاشے) ایران در ہند کی ایک مسلسل فارسی غزل "ہند عزیز مرا بپذیر" کے عنوان سے ہے،

آقاے ہاشم کاردوش اپنے حسن اخلاق اور ذوق علمی کی وجہ سے دہلی کے علمی حلقہ میں بہت مقبول ہیں، ہند و ایران کو ثقافتی طور سے ایک دوسرے سے قریب تر کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ اسی لئے اپنی غزل کے مطلع میں کہا ہے،

اے عزیز آریائی من ز ایران آمدم ‏ ‏ من ز ایران برادر بر تو مہمان آمدم

اس غزل کے حسب ذیل دو شعر سے وہی لوگ لطف لیں گے جو ان کی تعلیمات سے واقف ہیں،

باسیہ چشمان کشمیری نیاز آیند باز ‏ ‏ با نواے حافظ آن مرغ خوش لحان آمدم

طوطیان شکر شکن کردند در اقصاے ہند ‏ ‏ با چنین قندے کہ من از شکرستان آمدم

اخیر میں جناب خواجہ محمد یوسف (مینجنگ اڈیٹر انڈو ایرانیکا) اور جناب ام۔ اے مجید صاحب جنرل سکریٹری ایران سوسائٹی دلی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ان کی محنت و کاوش سے انڈو ایرانیکا کا یہ سلور جوبلی نمبر اپنے دیرینہ شاندار روایت و معیار کے ساتھ شائع ہو کر ارباب علم کے ہاتھوں میں ایک عمدہ علمی تحفہ کی صورت میں پہنچ گیا، اس باتصویر رسالہ کی ضخامت ۲۲۱ صفحے ہے، ایران سوسائٹی ۱۲۔ ڈاکٹر ام۔ اسحٰق روڈ۔ کلکتہ ۱۶ سے مل سکتا ہے۔

مطبوعاتِ جدیدہ

فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر :- مرتبہ - مولانا محمد تقی امینی صاحب تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۳۳۶ مجلد مع گرد پوش قیمت لعہ٭ قیمت غیر مجلد عہ٭ پتہ - ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

فاضل مصنف نے "اسلامی فقہ و اجتہاد" پر جو ان کا خاص موضوع ہے کئی کتابیں لکھی ہیں اور وقتاً فوقتاً اس پر محققانہ مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں۔ اس کتاب کا پہلا اڈیشن عرصہ ہوا چھپا تھا۔ اب ترمیم و اضافہ کے بعد اس کو دوبارہ شائع کیا ہے، اس میں فقہ کا لغوی و اصطلاحی مفہوم، اس کی مختصر تاریخ، عہد بعہد ارتقاء، اس کے مآخذ، اصول، فقہی احکام میں تخفیف و سہولت اور فقہاء کے اختلافات کے اسباب پر مدلل و مربوط بحث کی گئی ہے۔ ہر بحث مصنف کی محنت و تحقیق، بالغ نظری اور فقہی دیدہ وری کا نمونہ ہے، کتاب چھ حصوں میں منقسم ہے۔ تیسرا اور چوتھا باب خصوصیت سے اہم ہیں۔ اول الذکر میں اسلامی فقہ کے بارہ مآخذ، (۱) قرآن حکیم (۲) سنت (۳) اجماع (۴) قیاس (۵) استحسان (۶) استصلاح۔ (۷) استدلال (۸) ماقبل کی شریعت (۹) تعامل (۱۰) مسلمہ شخصیتوں کی رائیں (۱۱) عرف و رواج (۱۲) ملکی قانون کی مفصل وضاحت کی گئی ہے، اور چوتھے باب میں ان فقہی اصول و کلیات کا ذکر ہے جن سے فقہاء نے احکام کی جمع و تدوین میں مدد لی ہے۔ مثلاً مشقت، حرج، ضرر، عذر اور ضرورت وغیرہ، لائق مصنف نے ان مباحث پر اس قدر معلومات جمع کر دیے ہیں

جو عربی کتابوں میں بھی یکجا نہ مل سکیں گے۔

فاضل مصنف فقہ کی جدید تشکیل و تدوین کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں سے پوری طرح واقف اور موجودہ حالات میں اجتہاد کے بند دروازہ کو کھولنے کے حامی ہیں، یہ کتاب اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور اس سے فقہ کی تشکیل جدید میں مدد ملے گی،

انگریزی ادب کی مختصر تاریخ :- مرتبہ - ڈاکٹر محمد یسین صاحب متوسط سائز، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۳۵۰ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت ع۵ ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڈھ

انگریزی ادب کی اس مختصر تاریخ میں اس کی ابتداء (۶۷۰ء) سے موجودہ صدی تک کے شعر و ادب کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ اور یہ مندرجہ ذیل سات ابواب پر مشتمل ہے (۱) ابتدائی انگریزی ادب (۶۷۰-۱۵۳۰) (۲) نشأۃ ثانیہ (۱۵۳۰-۱۶۶۰) (۳) دور بحالی (۱۶۶۰ء-۱۷۰۰ء) (۴) جدید کلاسیکی دور اور پیش رومانی عہد (۱۷۰۰-۱۷۹۸) (۵) رومانی دور (۱۷۹۸-۱۸۳۲) (۶) عہد وکٹوریہ (۱۸۳۲-۱۹۰۰) (بیسویں صدی (۱۹۰۰-۱۹۶۰)

لائق مصنف نے اس کتاب میں انگریزی ادب کی ابتداء و ارتقاء کی سرگذشت اور مختلف اصناف خصوصاً شاعری، ڈرامہ، ناول، انشائیہ اور رپورتاژ وغیرہ کے عہد بعہد فروغ و ترقی کی داستان بھی بیان کی ہے اور ہر عہد کے نامور و ممتاز اصحاب فن و کمال کا مختصر تذکرہ اور ان کی اہم اور بلند پایہ تصنیفات کی قابل ذکر خصوصیات بھی تحریر کی ہیں، گو یہ کتاب محنت و کاوش سے لکھی گئی ہے، لیکن انگریزی جیسی وسیع اور بین الاقوامی زبان و ادب کی ہزار سالہ تاریخ کو ایک مختصر کتاب میں نہیں سمیٹا جا سکتا اور نہ صرف اردو جاننے والے اس سے خاطر خواہ مستفید ہو سکیں گے تاہم اردو میں غالباً اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے اس لیے قابل قدر اور آئندہ لکھنے والوں کے لئے ایک خاکہ کا کام دے گی۔

اردو کا المیہ :- از پروفیسر مسعود حسین خانصاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۴۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲؎ پتہ (۱) شعبۂ لسانیات علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

پروفیسر مسعود حسین خان صاحب حال وائس چانسلر جامعہ ملیہ دہلی نے، انجمن ترقی اردو کے اخبار ہماری زبان میں اردو سے متعلق بڑے مفید مضامین اور اداریے لکھے تھے۔ ان میں اردو کے رسم الخط اس کی لسانی، تعلیمی اور تہذیبی اہمیت، علاقائی اور دستوری حیثیت، اس کی حق تلفی، اس کے ساتھ حکومت کی زیادتیوں، سیاسی پارٹیوں کی وعدہ خلافیوں، اردو دانوں کی جد وجہد اور ان کی کوتاہیوں اور آئندہ کے طریقہ کار کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اور پوری قوت واستدلال سے اردو کی حمایت کی گئی ہے۔ جس سے اردو سے متعلق جملہ مسائل، اس کا ہر پہلو اور ۱۹۴۷ء کے بعد سے اس کی پوری سرگذشت سامنے آجاتی ہے۔ انداز بیان سنجیدہ ومتین لیکن پرزور اور دلنشیں ہے ان مضامین کی حیثیت عارضی نہیں بلکہ مستقل ہے اس لئے مرزا خلیل احمد بیگ صاحب نے اس کو کتابی شکل میں مرتب کر دیا ہے۔ کتاب کے شروع میں فاضل مرتب کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ ہے۔ پروفیسر صاحب کی نظر ان مسائل پر بڑی گہری اور مبصرانہ ہے اور انھوں نے بڑی خوبی سے ان کا احاطہ کیا ہے اس لئے۔ اس کی حیثیت اردو کے حقوق کی دستاویز کی ہو گئی ہے۔ ... اور وہ اہل علم اور خاص طور پر اردو کے حامیوں کے مطالعہ کے لائق ہے۔

سیرت رسولؐ :- مترجمہ :- مولوی طلحہ بن ابو سلمہ ندوی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۱۵۲ قیمت ۳؎ پتہ ادارہ ترجمہ وتالیف ۲۰۔ پھول بگان روڈ، کلکتہ ۱۴۔

زیر نظر کتاب علامہ ابن قتیبہ دینوری (م ۲۷۶ھ) کی شہرۂ آفاق کتاب المعارف کے اس حصہ کا ترجمہ ہے جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے متعلق ہے، اس میں پہلے آپ کے نسب وخاندان، اجداد واعمام، پھوپھیوں، دادیوں، نانیوں، ازواج مطہرات آل اطہار اور غلاموں وغیرہ کا تذکرہ اور آخر میں ولادت وبعثت اور غزوات وغیرہ کا بیان ہے۔ متن کے اختصار کی وجہ سے لائق مترجم نے حاشیے میں بعض وضاحت طلب امور کی تفصیل اور قابل ذکر بحثوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ اور آخر میں اخلاق وعادات کا باب بھی شامل کر دیا ہے۔ اردو میں سیرت پر مبسوط ومحققانہ کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مگر یہ تیسری صدی ہجری کی تصنیف کا ترجمہ ہونے کی بنا پر سیرت نبوی پر مستند ماخذ ہے۔

الاعلام فی کلام اللہ الملک العلام :- مرتبہ جناب عادلہ صاحب، تقطیع متوسط کاغذ کتابت وطباعت اچھی صفحات ۱۶ قیمت عہ پتہ گوہر پرنٹنگ پریس ۶۹۱ تریپلیکین ہائی روڈ، مدراس ۵۔

یہ کتاب قرآن مجید کی اسماء واعلام کا اشاریہ ہے، لائق مرتبہ نے انبیاء، ملائکہ، شیاطین اور اقوام وبلاد واصنام وغیرہ کے جو الفاظ اور نام قرآن مجید میں آئے ہیں ان کو حروف تہجی کے رو سے مرتب کر دیا ہے، اور ان سورتوں اور آیتوں کے بھی نمبر دیدئے ہیں، لیکن مختلف نوعیت کے ناموں کو ایک ساتھ ذکر کر کے خلط ملط کر دیا گیا ہے، اگر مختلف نوعیت کے ناموں کا علیحدہ علیحدہ ذکر کیا جاتا جیسے انبیاء کے عنوان کے ماتحت تمام انبیاء کا، معبود کیا جاتا اسی طرح اقوام وبلاد کے مستقل عنوانات قائم کر کے ان کے ماتحت قوموں اور شہروں کے نام دے گئے ہوتے تو زیادہ سہولت ہوتی، عبادات میں حج کا انڈکس تو دیا گیا ہے لیکن صلوٰۃ وزکوٰۃ اور صیام کا نہیں ہے، اسی طرح شیاطین وملائکہ کا انڈکس ہے، مگر جنوں کا نہیں، بعض جگہ حوالے بھی غلط درج ہو گئے ہیں، مثلاً حزب اللہ کے لئے صرف سورۂ مائدہ کا حوالہ دیا گیا ہے

حالانکہ یہ لفظ سورہ مجادلہ میں بھی آیا ہے، ان فروگذاشتوں سے قطع نظر یہ ایک مفید علمی وقرآنی خدمت ہے۔ مگر قیمت زیادہ ہے۔

کلام حشرؔ و پیام حشرؔ:- مرتبہ۔ جناب عبدالقدوس صاحب نیرنگ، تقطیع خورد کاغذ کتابت وطباعت معمولی صفحات ۱۵۰ اور ۴۸ قیمت ۱/۵۰ پیسے ۲/ عہ پتہ کتاب محل، دال منڈی، وارانسی۔

آغا حشر کاشمیری مرحوم کی اصل شہرت ان کے ڈراموں کی وجہ سے ہے۔ لیکن وہ بڑے ذہین وطباع اور شعلہ نوا شاعر بھی تھے، مذکورۂ بالا کتابوں میں اول الذکر ان کی غزلیات کا مجموعہ ہے، اس میں ان کے حالات وکمالات اور شاعرانہ خصوصیات کا بھی ذکر ہے اور اسکے شروع میں آغا صاحب کے متعلق پرانے اخبار ورسائل کے اقتباسات نقل کئے گئے ہیں۔ دوسرے میں آغا صاحب کی دو مشہور ولولہ انگیز نظمیں "شکریہ یورپ" اور "موج زمزم" درج ہیں یہ دونوں نظمیں انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسوں میں پڑھی گئی تھیں اور بڑی پر زور اور موثر ہیں لائق مرتب نے ان کی خصوصیات بھی تحریر کی ہیں آغا صاحب کے متعلق مضامین بہت لکھے گئے۔ لیکن غالباً ابھی تک نہ ان کا مجموعہ کلام شائع ہوا تھا اور ان کے ادبی وفنی خدمات کے بارہ میں کوئی مستقل کتاب لکھی گئی تھی۔ اس لیے یہ دونوں مجموعے غنیمت ہیں۔ لیکن ان کی ترتیب میں خوش سلیقگی کی کمی ہے۔ اور آغا صاحب کے ادبی وشعری خدمات کا تجزیہ بھی ڈھنگ سے نہیں کیا گیا ہے۔

"ض"

مختصر فہرست کتب

سلسلۂ سیرۃ النبی، سیر الصحابہ و تاریخ اسلام کے علاوہ دارالمصنفین نے اور بھی بہت سی کتابیں شائع کی ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:-

دینِ رحمت

بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، اسی طرح وہ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کے تمام طبقوں، بلکہ تمام کائنات کے لئے سراسر عدل و رحمت تھا، اس کتاب میں اسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ۸/ شاہ معین الدین احمد ندوی

سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ

خلفائے بنو امیہ میں مختلف حیثیتوں سے عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور خلفائے راشدین کی طرح بڑے خیر و برکت کا دور رہا ہے، بلکہ تاریخ میں وہ اپنے عدل و انصاف کے لحاظ سے عمر ثانی کی حیثیت سے مشہور ہیں، انھوں نے اپنے دور میں پچھلے خلفا کے دور کی تمام بے عنوانیوں کو ختم کر دیا تھا، یہ انہی کی مولانا عبدالسلام ندوی کے سحر طراز قلم سے سوانح عمری ہے جس میں ان کے حالاتِ زندگی کے ساتھ ان کے مجددانہ کارنامے بھی آگئے ہیں، قیمت:- للعہ

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری کے ساتھ حضرت شمس تبریز کی ملاقات کے بعد ان میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت:- ۱۰ روپیہ ۵۰ پیسہ

مؤلفہ:- قاضی تلمذ حسین مرحوم

"مینیجر"